Phone 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

مارچ 1968

بتقریب یومِ پاکستان

قائدِ اعظم کا ارشاد

(حیدرآباد - دکن میں)

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمنٹ کی۔ نہ کسی شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اسلامی حکومت قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی کا نام ہے۔

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ : ایک روپیہ

پرویز صاحب کی عمر بھر کی قرآنی فکر کا ماحصل

انقلاب انگیز کتابیں

انسان نے کیا سوچا؟

کیا تنہا عقلِ انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت کر سکتی ہے؟ اس اہم اور پیچیدہ سوال کا جواب یونان کے فلاسفروں سے لے کر جاریہ زمانے کے مفکرین اور سائنسدانوں نے کیا دیا ہے؟ یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں سے مستغنی کر دے گی۔ بڑی تقطیع خوبصورت ٹائپ۔

عمدہ سفید کاغذ مجلد (بارہ روپے)

سلیم کے نام خطوط

ہمارا تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ ایک عجیب کشمکش میں گرفتار ہے۔ اسلام کے متعلق اس کے دل میں بے شمار شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں لیکن اسے ان کا کہیں سے اطمینان بخش جواب نہیں ملتا۔ جب وہ اس طرح مذہب سے متنفر ہو جاتا ہے تو فتوے اس کو سے لگائے جاتے ہیں۔ اسے کوستے نہیں۔ یہ کتاب دیکھئے اور پھر دیکھئے کہ وہ کس طرح صحیح اسلام کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ خطوط کا انداز بڑا دلکش اور بلکا پھلکا ہے۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ کاغذ۔ مجلد پہلی جلد آٹھ روپے۔ دوسری اور تیسری جلد (چھ روپے فی جلد)

لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں بلکہ مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس کی تعلیم کیا ہے۔ اس کی دعوت کیا ہے۔ قرآن نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا مقام کیا متعین کرتا ہے۔ چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم جدیدہ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ خوشنما ٹائپ۔ عمدہ سفید کاغذ۔ خوبصورت جلد پہلی تین جلدوں کی قیمت پندرہ روپے فی جلد چوتھی جلد بیس روپے۔ مکمل سیٹ پچاس روپیہ۔

بصیرت افروز کتابیں

دلفریب کتابیں

سلسبیل

پرویز صاحب کے خطبات اور مقالات نے ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کے دل و دماغ میں عجیب خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ سلسبیل انہی خطبات و مقالات کا دلکش مجموعہ ہے جس میں زندگی کے مختلف گوشے نکھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ ایسی کتابیں عہد آفریں ہوتی ہیں۔ کتابت طباعت کاغذ عمدہ۔ قیمت مجلد آٹھ روپے

اسلام کیا ہے

یہ مسائل کی کتاب نہیں۔ یہ آپ کو بتاتی ہے کہ اسلام کے بنیادی تصورات کیا ہیں۔ وہ کس قسم کا معاشرتی، معاشی اور سیاسی نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کی رو سے انسانی پیدائش کا مقصد کیا ہے اور اس کی غرض و غایت کیا۔ اور معاشرہ میں عورت کا صحیح مقام کیا ہے۔ (قسم اعلیٰ - آٹھ روپے)

(سستا ایڈیشن - چار روپے)

معلومات افزا کتابیں

ناظم ادارہ طلوع اسلام ــــ ۲۵ بی گلبرگ ــــ لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیّت کا پیامبر!

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک

سالانہ ـــ پاکستان ـــ دس روپے

سالانہ ـــ ہندوستان ـــ پندرہ روپے

سالانہ ـــ غیر ممالک ـــ ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ

پاکستان ؛ ایک روپیہ

ہندوستان ؛ ڈیڑھ روپیہ

ٹیلیفون

۸۰۸۰۰

خط و کتابت

ناظم ادارہ

طلوعِ اسلام

۲۵-بی- گلبرگ ۲- لاہور

جلد (۲۱) مارچ ۱۹۶۸ء شمارہ (۳)

فہرست

۱۔ لمعات ـــــــ ۲

۲۔ وا ردکوئی سوتح ان کی پریشاں نظری کا ـــــــ ۹

۳۔ سائنس اور ایمان بالغیب ـــــــ ۱۴

۴۔ اسلامک سوشلزم ـــــــ ۲۲

۵۔ برطانیہ کا عالمی کردار (محترم خورشید عالم صاحب) ـــــــ ۲۹

۶۔ حقائق و عبر ـــ دسویں سے آڑ گئے باقی کتنے بچے ـــ (حرام کار کو مت روکو) ـــ (اسکی وجہ منافقت ہے) ـــ (یا مقلب القلوب) ـــ (یہ مقام بلند) ـــــــ ۳۶

۷۔ میں نے اس درس سے کیا پایا؟ ـــ (محترم ڈاکٹر عبدالودود صاحب) ـــــــ ۴۱

۸۔ باب المراسلات ـــ (بین الاقوامی اسلامی کانفرنس) ـــ (پرسش غم کا شکریہ) ـــــــ ۶۰

۹۔ مطالب الفرقان ـــــــ ۶۵—۸۰

ایڈیٹر محمد خلیل، ناشر سراج الحق، مقامِ اشاعت - ۲۵/بی، گلبرگ ۲۔ لاہور، پرنٹر شیخ محمد شرف، مطبوعہ۔ اشرف پریس ایبک روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

یہ آواز اب دنیا کے ہر گوشے سے سنائی دیتی ہے کہ مذہب کو سیاست سے کیا واسطہ؟ اور حامیانِ مذہب کے ہاں سے اس کا کوئی اطمینان بخش جواب نہیں ملتا۔ بات ہے بھی ٹھیک۔ ایک شخص صبح اٹھ کر رام نام جپتا، اور کرشن مہاراج کی پوجا کرتا ہے۔ دوسرا گرجا میں جا کر کچھ مقدس گیت گا لیتا ہے۔ تیسرا مسجد میں خدا کے حضور سجدہ کرتا ہے۔ اس کے بعد تینوں اقوامِ متحدہ کے ایوان میں پہنچ کر اس مسئلہ پر غور کرتے ہیں کہ ویٹ نام کے معاملہ میں ہمیں کیسا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیئے۔ وہاں یہ تینوں اپنے اپنے نقطۂ نگاہ سے اور اپنی اپنی مملکت کے مصالح کے پیشِ نظر اس بحث میں حصہ لیتے ہیں اور اس پر نہ رام نام کی مالا اثر انداز ہوتی ہے نہ گرجے کے مقدس گیت۔ نہ ہی وہاں مسجد میں سجدہ ادا کرنے والے کی نماز ہی اپنا کوئی امتیازی نشان دکھاتی ہے۔ اس سے انسان لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ سیاست میں مذہب کا کوئی دخل نہیں۔ مذہب خدا اور بندے کے درمیان ایک پرائیویٹ تعلق کا نام ہے جس کا مقام پرستش گاہوں کی چار دیواری کے اندر ہے۔ امورِ سیاست کے فیصلے مملکتوں کی مصلحتوں کے مطابق طے پاتے ہیں۔ اور انہیں اسی طرح طے بھی پانا چاہیئے۔ چنانچہ دنیا کی سیکولر حکومتوں میں مذہبی فرائض و رسوم اپنی جگہ ادا ہوتے رہتے ہیں اور امورِ سلطنت اپنے طور پر سرانجام پاتے جاتے ہیں۔ دونوں کے دوائر الگ الگ ہیں جن میں ایک دوسرا دخیل نہیں ہوتا۔ اور انسانی معاشرہ "بخیر و خوبی" آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، حامیانِ مذہب کی طرف سے اس اعتراض کا کوئی اطمینان بخش جواب بن نہیں پڑتا۔ اس کا نتیجہ ہے کہ مذہب نے اب آہستہ آہستہ اپنے آپ کو سمیٹ لیا ہے اور سیکولر نظامِ حکومت دنیا کا عام چلن ہوتا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کا قدامت پرست طبقہ بھی اسلام کو 'منجملہ مذاہبِ عالم' ایک مذہب ہی سمجھتا ہے۔ اس لئے عملاً اس کی پوزیشن بھی دیگر اہلِ مذاہب سے مختلف نہیں۔ البتہ وہ یہ مطالبہ پیش کرتا ہے کہ جن قوانین کو اس نے 'قوانینِ شریعت' کا نام دے رکھا ہے، انہیں علیٰ حالہ قائم رکھا جائے۔ لیکن چونکہ یہ قوانین، جنہیں آج سے صدیوں پہلے کے قانون دان حضرات فقہا

نے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق مرتب کیا تھا، زمانہ حاضرہ کے مقتضیات کا ساتھ نہیں دیتے' اس لئے مسلمان حکومتیں عموماً انہیں خیرباد کہنے پر مجبور ہو رہی ہیں' اس لئے مملاً ان کا موقف بھی سیکولر ہوتا چلا جا رہا ہے۔

لیکن قرآن کا تقاضا کچھ اور ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اسلام 'مذہب نہیں' دین ہے۔ اور اگر دین کو سیاست سے الگ کر دیا جائے تو دنیا میں فساد ہی فساد برپا ہو جاتا ہے۔ دین نام ہے زندگی کے غیر متبدل اصولوں کا۔ اور ان اصولوں پر اپنے اپنے زمانے میں عمل پیرا ہونے کو شریعت کہا جاتا ہے مسلمان کا ایمان یہ ہے کہ زندگی کے یہ اصول کسی حالت میں بھی بدل نہیں سکتے۔ اور امور سیاست کا فیصلہ ان اصولوں کے مطابق ہوگا۔ حکومت کی مصلحتیں ان اصولوں پر کبھی بھی اثر انداز نہیں ہو سکتیں۔ اگر کوئی حکومت ان اصولوں کو نظر انداز کر دیتی ہے تو اسے اسلامی حکومت نہیں کہا جائے گا۔ نہ ہی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا ہے جو ان اصولوں کے حیطۂ اقتدار سے باہر ہو۔ جب سیاست دین کے تابع ہوگی تو اس وقت امور مملکت کس طرح طے پائیں گے' اس کا اندازہ ایک مثال سے لگائیے۔ جب دیتنام کا مسئلہ' اقوام متحدہ کے ایوان میں پیش ہوگا تو ہر ایک مملکت کا نمائندہ اس پر اپنی اپنی مملکت کے مصالح کی روشنی میں غور کرے گا۔ لیکن دین پر مبنی مملکت کے نمائندہ کے سامنے اصول یہ ہوگا کہ

لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا - اِعْدِلُوْا - هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۔ (۵/۸)

دیکھنا! کوئی قوم اگر تمہاری دشمن بھی ہے تو اس کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم اس کے معاملہ میں عدل سے کام نہ لو۔ ہمیشہ عدل کرو۔ کیونکہ یہ بات تقوٰے سے زیادہ قریب ہے۔

یہ نمائندہ وہاں یہ نہیں دیکھے گا کہ میری مملکت کا فائدہ کس میں ہے۔ وہ یہ دیکھے گا کہ عدل کا تقاضا کیا ہے اور وہ اسی کے مطابق رائے دے گا۔ خواہ یہ چیز خود اس کی اپنی مملکت کے بھی خلاف کیوں نہ جائے (وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ۔ ۴/۱۳۵) اس نے جو صبح خدا کے حضور سر جھکایا تھا تو وہ اس حقیقت کے اظہار کی علامت کے طور پر تھا کہ ہم ہر معاملہ میں تیرے قوانین کی اطاعت کریں گے۔

اب آپ سوچئے کہ کیا اس دین کو سیاست سے کوئی تعلق ہے یا نہیں؟ سیاست کو اس دین کے تابع رکھنے سے یہ دنیا کس طرح جنت بداماں ہو جائے گی' اس کا اندازہ تو شاید ہم نہ لگا سکیں (کیونکہ ہم نے ایسا فردوس آگیں منظر کبھی دیکھا نہیں) لیکن سیاست کے اس دین سے الگ ہو جانے سے انسانیت جس طرح جہنم درآغوش ہو جاتی ہے' اس کے سمجھنے میں تو کوئی دقت نہیں ہو سکتی۔ اس جہنم کی آگ میں تو (باقی دنیا کے ساتھ) ہم خود بھی جھلس رہے ہیں۔ عصر حاضر میں اس لادینی سیاست کا امام میکیاولی قرار دیا جاتا ہے جس کی کتاب (THE PRINCE) دنیا بھر کی قوموں کے

نزدیک صحیفۂ آسمانی ہے۔ اس صحیفہ کی تعلیم یہ ہے کہ

> بادشاہ کے لئے صفتِ روباہی نہایت ضروری ہے تاکہ وہ دجل وفریب کے جال بچھا سکے۔ اور اس کے ساتھ ہوتے شیری بھی تاکہ وہ بھیڑوں کو خائف رکھ سکے۔ صرف شیر کی قوت کافی نہیں۔ اس لئے عقلمند بادشاہ وہ ہے کہ جب وہ دیکھے کہ کوئی عہد یا معاہدہ اس کے اپنے مفاد کے خلاف جاتا ہے یا جن وجوہات کے پیشِ نظر وہ معاہدہ کیا گیا تھا وہ باقی نہیں رہیں، تو اسے بلا تامل توڑ ڈالے۔ لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ اس قسم کی عہد شکنی کے لئے نہایت نکاہ فریب دلائل بہم پہنچائے جائیں۔

آگے چل کر اس میں کہا گیا ہے۔

> جو بادشاہ اپنے پاؤں مستحکم رکھنا چاہتا ہے اس کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ بدی کس طرح کی جاتی ہے اور اس کے لئے کونسا وقت سب سے زیادہ موزوں ہے۔ اس میں خوبیوں کا ہونا ضروری نہیں۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ بظاہر معلوم ہو کہ اس میں خوبیاں موجود ہیں۔ اگر اس میں کوئی خوبی پیدا ہو جاتی ہے تو اس میں چنداں مضائقہ نہیں لیکن یہ ضروری ہے کہ اس کے دل کی حالت ہمیشہ ایسی رہے کہ جونہی وہ دیکھے کہ مصلحت وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اس خوبی کو یکسر الگ کر دیا جائے تو وہ بلا تامل وتوقف اس کے خلاف عمل کر سکے۔

یہی وہ سیاست ہے جس کے پیشِ نظر لارڈ گرے نے کہا تھا کہ

> سلطنت کے معاملات، اخلاقی ضابطوں کی رو سے طے نہیں پا سکتے۔

اور وال پول نے لکھا تھا کہ

> نیک آدمی کسی سلطنت کو کبھی بچا نہیں سکتے۔ اس لئے کہ سلطنتوں کو بچانے کے لئے جس حد تک چلے جانا بعض اوقات ضروری ہو جاتا ہے، نیک آدمی وہاں تک جا نہیں سکتے۔

اور اٹلی کے مشہور مدبر (CAVOUR) نے اعتراف کیا تھا کہ

> اگر ہم وہی کچھ اپنی ذات کے لئے کریں جو کچھ ہم نے مملکت کے لئے کیا ہے، تو ہم کتنے بڑے شیطان کہلائیں۔

اس قسم کی سیاست، دوسری قوموں کے ساتھ کیا کرتی ہے، اس کا عملی تجربہ ہمیں گذشتہ بیس سال سے ہو رہا ہے ایک کشمیر کے مسئلہ کو لیجئے۔ یہ مسئلہ ایسا نہیں جس کے متعلق بھارت اور پاکستان میں کوئی خفیہ بات چیت ہوئی ہو۔ یہ مسئلہ دنیا کی سب سے بڑی بین الاقوامی عدالت (اقوام متحدہ) میں پیش ہوا اور وہاں طے یہ پایا کہ کشمیر ایک متنازعہ فیہ مسئلہ ہے جس کا حل یہ ہے کہ اہلِ کشمیر خود اس کا فیصلہ کریں کہ وہ پاکستان کے ساتھ رہنا چاہتے

ہیں یا ہندوستان کے ساتھ۔ بھارت کی حکومت نے اس فیصلہ کو تسلیم کر لیا تھا اور اس میں اس کے بعد آج تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ ان بیس سال کے عرصہ میں پاکستان نے بار بار اس کی کوشش کی کہ بھارت اس فیصلہ کو بروئے کار لانے پر آمادہ ہو جائے لیکن اس نے ایک نہیں سُنی۔ یہ مسئلہ بھارت اور پاکستان میں باہمی اختلاف کی اصل و بنیاد ہے۔ اب بھارت کی کیفیت یہ ہے کہ وہ دنیا کے سامنے شور مچاتا ہے کہ ہم اس اختلاف کو ختم کرنے کے لئے ہر وقت آمادہ ہیں لیکن پاکستان اس طرف آتا ہی نہیں۔ اور جب پاکستان کہتا ہے کہ آؤ! اس سوال پر غور کریں تو وہ صاف کہہ دیتا ہے کہ کشمیر تو ہندوستان کا اٹوٹ انگ ہے، اس لئے اس پر کسی قسم کی گفتگو ہو نہیں سکتی۔ کوئی اور بات کیجئے۔ اِدھر یہ کہتا ہے اور اُدھر پھر چلانا شروع کر دیتا ہے کہ دیکھئے! پاکستان، امن اور صلح کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوتا۔ وہ یہ کچھ کرتا ہے۔ دھڑلے سے کرتا ہے۔ بلا کسی جھجک اور ندامت کے کرتا ہے۔ اور کئے چلا جاتا ہے۔

یہ رویہ بھارت کا ہے۔ اس کے بعد دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں کے "امن و سلامتی" کے پیامبر اور مصالحت وخیر سگالی کے دعویدار آتے ہیں۔ پاکستان سے کہہ دیتے ہیں کہ تمہارا موقف بالکل درست ہے۔ تم حق بجانب ہو۔ اور یہی کچھ بھارت سے کہہ دیتے ہیں اور مشترکہ اعلامیہ میں دونوں کو نہایت ناصحانہ انداز سے مشورہ دیتے ہیں کہ تمہیں چاہیئے کہ اپنے اختلافی معاملات کا تصفیہ باہمی گفت و شنید سے پُرامن طریقے سے کر لو۔ اختلاف اور جنگ بہت بُری چیزیں ہیں۔ یہ کچھ گزشتہ بیس برس سے ہو رہا ہے۔ نہ ان سلطنتوں کے اندر کوئی خدا کا بندہ ایسا ہے جو بھارت سے کہے کہ تمہیں اپنے معاہدہ کو اس طرح توڑتے ہوئے شرم آنی چاہیئے، نہ اقوامِ متحدہ خود آگے بڑھ کر اپنے فیصلے کو بروئے کار لانے کے لئے کچھ کرتی ہے۔ یہ کچھ بیس برس سے ہو رہا ہے اور اہلِ کشمیر، بھارت کے استبداد کی چکی میں پستے چلے جا رہے ہیں۔ اور اب تو ان بیچاروں کی حالت نزع تک پہنچ چکی ہے۔ ۱۹۶۵ء میں بھارت نے اپنے حمایتیوں کی شہ پر یہ چاہا کہ اس تنازعہ کو تلوار کے زور سے ختم کر دیا جائے لیکن اہلِ پاکستان کے جذبۂ حق و صداقت اور یقینِ محکم نے ایسا کرشمہ دکھایا کہ بھارت کی تلوار خود اس کے قلب میں پیوست ہو گئی۔ اسے میدانِ جنگ سے بھاگتا دیکھ کر، اس کے حمایتی پھر امن کے علمبردار بن کر بیچ بچاؤ کرنے کے لئے آ دھمکے۔ پھر فراخدلی کے وعدوں کی تجدید ہوئی۔ جب شکست خوردہ بھارت پھر سے اپنے آپ میں آیا تو اس نے وہی پرانے حیلے برتنے شروع کر دیئے اور ان صلح کرانے والوں میں سے بھی کوئی اس سے نہیں کہتا کہ تم اپنے وعدوں سے کیوں پھر رہے ہو؟

یہ ہیں اس سیاست کے کرشمے جو دین سے الگ ہو کر "چنگیزی" بن جاتی ہے۔ اب آپ نے سمجھا کہ قرآن نے اسے کیوں شرطِ ایمان قرار دیا تھا کہ سیاست ہمیشہ دین کے تابع رہے؟ اس سیاست پر ایمان رکھنے والا جب کسی قوم سے کوئی معاہدہ کرتا ہے تو اس کے سامنے دین کا یہ غیر متبدل حکم ہوتا ہے کہ

وَ اَوۡفُوۡا بِالۡعَهۡدِ ۚ اِنَّ الۡعَهۡدَ كَانَ مَسۡـُٔوۡلًا ۔ (۱۷/۳۴)

تم اپنے عہد و پیمان کو پورا کرو۔ یاد رکھو! اس کے متعلق تم سے باز پرس ہوگی۔

یہ ہے فرق ایک سیکولر اسٹیٹ اور دینی ریاست میں۔ ہمارے ہاں جن حضرات کے دل میں رہ رہ کر سیکولر اسٹیٹ کا تصور کروٹیں بدلتا ہے، ہم ان سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ آپ ذرا سینے پر ہاتھ رکھ کر کہئیے کہ جن دو نظاموں کا تقابلی نقشہ آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے، آپ ان میں سے کس نظام کے تابع زندگی بسر کرنا پسند کرینگے؛ سیکولر اسٹیٹ کے تابع یا قرآن کی رُو سے متشکل کردہ دینی ریاست کے اندر۔

لیکن یہ حضرات بھی سچے ہیں۔ ان کے سامنے دینی ریاست کا جو نقشہ پیش کیا جاتا ہے، اس کا اصول یہ ہے کہ؛

زندگی کی بعض ضروریات ایسی ہوتی ہیں جن کے لئے جھوٹ بولنا نہ صرف جائز بلکہ شرعًا واجب ہوجاتا ہے۔ (سید ابو الاعلیٰ مودودی)

وہ کہتے ہیں کہ اس دینی ریاست سے تو سیکولر اسٹیٹ ہزار درجہ اچھی ہوتی ہے۔ اس میں کم از کم جھوٹ کو "آسمانی سند" تو حاصل نہیں ہوتی۔

یہ ہیں وہ لوگ جو اسلام کے راستے میں ہمیشہ حائل رہے ہیں۔ اور آج بھی اسلام کا نام لے کر، لوگوں کو اسلام کے قریب آنے سے روکتے ہیں لیکن اب ان کا چراغ زیادہ عرصہ تک جل نہیں سکتا۔ دنیا سیکولر نظام سے بھی تنگ آچکی ہے اور خدا کے نام کو (EXPLOIT) کرنے والے مذہبی مفاد پرستوں سے بھی۔ اسے بالآخر دین کی طرف آنا ہوگا۔ اور ایسا ہو کر رہے گا۔ یہ وہ نظام ہوگا جس کی خصوصیت یہ ہوگی کہ لَا تَمۡلِكُ نَفۡسٌ لِّنَفۡسٍ شَيۡـًٔا ؕ وَالۡاَمۡرُ يَوۡمَئِذٍ لِّلّٰهِ (۸۲/۱۹) اس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کو اپنا وسیلہ اور آلۂ کار نہیں بنا سکے گا اور تمام امور کے فیصلے مستقل اقدارِ خداوندی کے مطابق ہوں گے۔

(۰)

۲۔ بین الاقوامی اسلامی کانفرنس

فروری کے دوسرے ہفتہ میں، راولپنڈی میں، ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کے زیرِ اہتمام نزولِ قرآن کریم کے صد سالہ جشن کے سلسلہ میں ایک بین الاقوامی اسلامی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کے انعقاد کی خبر ہمارے لئے بڑی خوش کن اور مسرت افزا تھی کیونکہ ہر وہ اقدام جو امت کو قرآن کے قریب لانے کا موجب ہو، ہمارے نزدیک باعثِ صد تحسین ہوتا ہے لیکن جب اس کانفرنس کے پروگرام کا اعلان ہوا تو ہماری یہ خوشی، اضطراب سے بدل گئی کیونکہ اس میں ایک ایسی شق رکھی گئی تھی جس کے نتائج

ہمارے نزدیک بڑے پُرخطر اور جس کے عواقب بڑے دُوررس ہوسکتے تھے، پروگرام میں کہا گیا تھا کہ کانفرنس میں (منجملہ دیگر امور مثل انشورنس اور بنکنگ) عائلی قوانین پر بھی بحث کی جائیگی۔ جیسا کہ معلوم ہے، ملک کے ایک شورش پسند طبقہ نے عائلی قوانین کے مسئلہ کو ایک عرصہ تک قوم میں انتشار پھیلانے کا موجب بنائے رکھا تھا اور خدا خدا کرکے یہ فتنہ بہزار دقت فرو ہوا تھا۔ اب اس مسئلہ کو اس قسم کی کانفرنس میں زیرِ بحث لانا، اس فتنہ کی چنگاری کو خواہ مخواہ ہوا دینے کے مرادف تھا۔ جماعتِ اسلامی نے اس آگ کو ازسرِنو بھڑکانے کے لئے پہلے ہی سے تیاری شروع کر دی تھی اور اس کے ترجمان (اخبار ایشیا) نے اپنی ۲۸ فروری کی اشاعت میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے، لکھ دیا تھا کہ "یہ تماشہ دیکھنے کے قابل ہوگا"۔ اس سے ہمارا دل دھڑکا تھا۔

بارے غنیمت ہے کہ اربابِ نظم و نسق میں سے کسی نے ادارہ کی اس حماقت کا بروقت احساس کر لیا اور فیصلہ یہ کیا گیا کہ اس قسم کے متنازعہ فیہ مسائل پر بحث و تمحیص کیمرے (بند کمرے) میں خفیہ طور پر ہوگی۔ معلوم نہیں یہ بحث ہوئی یا نہیں ہوئی، اور ہوئی تو کیسے ہوئی۔ کانفرنس کے اختتام پر ادارہ کی طرف سے جو اعلامیہ شائع ہوا ہے اس میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ بہرکیف اس طرح (بھونڈے طریق ہی سے سہی) اس فتنہ کو دبا دیا گیا۔

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

لیکن ہم نے جس مقصد کے لئے اس مسئلہ کو زیرِ بحث لانا ضروری سمجھا ہے، وہ اور ہے۔ ہمارے ہاں عائلی قوانین کی حیثیت ایک نظری مسئلہ کی نہیں جس پر آزادانہ بحث و تمحیص کی جاسکتی ہے۔ یہ مسئلہ چھ سات برس سے، مملکت کا قانون بن چکا ہے اور اسکے مطابق ہزاروں مقدمات کے فیصلے ہو چکے ہیں۔ ہمارے ہاں، آئین کی رو سے کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہوسکتا جو کتاب و سنت کے خلاف ہو، عائلی مسائل کو قانونی حیثیت سے نافذ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ حکومت نے اس امر کا اطمینان کر لیا تھا کہ یہ قوانین کتاب و سنت کے خلاف نہیں۔ اب چھ سات برس کے بعد کسی کانفرنس سے یہ کہنا کہ ان قوانین پر غور کرکے ہمیں بتا دیجئے کہ یہ کتاب و سنت کے مطابق ہیں یا نہیں، اپنے مسلک قانون سازی کی ہنسی اڑانا ہے۔ اسکا صاف مطلب یہ ہے کہ حکومت ایک قانون تو نافذ کر دیتی ہے لیکن اسکے متعلق اسے یقین نہیں ہوتا کہ وہ آئینی طور پر درست ہے یا نہیں۔ اور اسکے بعد وہ اسکے متعلق لوگوں سے پوچھتی پھرتی ہے۔ سوچئے، کہ اس سے قوم کے دل میں قانون کا احترام کیا جائیگا؟ یہاں پہلے ہی یہ شور مچایا جا رہا تھا کہ یہ قوانین اسلام کے خلاف ہیں۔ ادارہ تحقیقاتِ اسلامی نے اپنے اس اقدام سے اس شورش پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔

علاوہ ازیں، اس سے ایک بڑی غلط نظیر (PRECEDENT) کی بھی طرح پڑ گئی۔ مملکت کے قوانین کے لئے حرفِ آخر (FINAL AUTHORITY) مملکت ہی کے کسی ادارہ کو ہونا چاہیئے۔ اس کے کسی قانون کو کسی بیرونی ادارہ کے سامنے تصدیق یا تردید کے لئے پیش کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اس قانون کے لئے قولِ فیصل (SUPREME AUTHORITY) مملکت نہیں، خارج از مملکت کوئی اور ادارہ ہے۔ اس کے نتائج جس قدر دُوررس ہوسکتے ہیں، قانون دان طبقہ اس کا اندازہ کر سکتا ہے۔ جب کوئی مسئلہ قانون سازی کے مراحل سے گزر رہا ہو اس پر ہر قسم کی بحث و تمحیص بھی ہوسکتی ہے اور حکومت

جس سے چاہے اس کے متعلق مشورہ بھی لے سکتی ہے لیکن جب وہ مسئلہ قانونی حیثیت اختیار کرلے تو اس کے لئے بحث وتمحیص کا پھاٹک کھلا رکھنا تو قانون کا مذاق اڑانا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ قانون ساز اتھارٹی غلطی کر سکتی ہے اس لئے اس کے فیصلوں پر نظرثانی کی گنجائش ہونی چاہیئے۔ ہمیں یہ تسلیم ہے لیکن اس قسم کی نظرثانی کے اختیارات، آئین کی رُو سے قائم کردہ خود مملکت ہی کے کسی ادارہ کو ہونے چاہئیں، نہ یہ کہ حکومت ایک قانون نافذ کرے اور ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، دنیا بھر سے لوگوں کو اکٹھا کرکے ان سے اس قانون پر نظرثانی کرائے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ اسلامی کانفرنس نے اس بارے میں کیا کہا ہے لیکن بالفرض اگر اس نے کہا ہو کہ یہ قوانین مطابق کتاب وسنت نہیں۔ تو ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس صورت میں حکومت کی پوزیشن کیا ہوگی؟ باقی رہا مشورہ لینا تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اسلامی مشاورتی کونسل اور خود ادارہ تحقیقاتِ اسلامی پر جو لاکھوں روپے صرف کئے جاتے ہیں۔ تو یہ بالآخر کس مرض کی دوا ہیں؟

بہرحال، غنیمت ہے کہ یہ معاملہ اس مرتبہ بروقت دبا دیا گیا۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ کے لئے حکومت ایسے معاملات میں احتیاط سے کام لیا کرے گی۔ یہ معاملات بڑے نازک ہیں انہیں بازیچۂ اطفال نہیں بنانا چاہیئے۔ جہاں تک عائلی قوانین کا تعلق ہے حکومت کو مطمئن رہنا چاہیئے کہ یہ قرآن کی طرف ایک مستحسن قدم ہے جس کے لئے قوم اس کی شکرگزار رہے!

این ہم غنیمت است

کانفرنس کی جس قدر روئیداد اخبارات میں شائع ہوئی ہے اس میں ایک بات ایسی سامنے آئی ہے جو فی الجملہ وجہ تسلی ہے۔ اس کی طرف سے شائع شدہ اعلامیہ میں کہا گیا ہے۔

> یہ کانفرنس تجویز کرتی ہے کہ اسلامی فکر کو، قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے، اسلام کے لئے ایک ایسے عصرِ نو کا راستہ ہموار کرنا چاہیئے جس کی بہار آفرینی اسے امن وسلامتی، کامرانی و مرفہ الحالی اور عسکری اصابت کی وادی میں لیجائے۔ اور ملتِ اسلامیہ کے ہر فرد کو ان حقوق ومراعات کی ضمانت دے جو اس کتابِ مقدس کی تعلیم واحکام کی رُو سے اسے حاصل ہو چکے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی دنیا اور آخرت کی کامیابیوں اور خوشگواریوں کی ساری عمارت قرآن ۔ اور خالص قرآن ۔ کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ اور انکی تباہی اس دن سے شروع ہوئی جب انہوں نے اپنے دین میں خارج از قرآن تصورات ونظریات کی آمیزش شروع کردی۔ ان کیلئے اس ذلت و پستی سے نکلنے کی صورت صرف یہ ہے کہ یہ پھر قرآن اور خالص قرآن کو اپنے لئے سندِ حجت قرار دیں اور اسی کی تعلیمات میں اپنے مسائل کا حل تلاش کریں۔

غنیمت ہے کہ شرکائے کانفرنس نے اس بنیادی حقیقت کا احساس کیا ہے۔ خدا کرے کہ یہ تجویز اپنے کاغذی پیراہن میں محض نقشِ فریادی بن کر نہ رہ جائے بلکہ اس کے مطابق عملی اقدامات بھی اٹھائے جائیں۔ ان اقدامات میں پہلا قدم یہ ہونا چاہیئے کہ اسلامی ممالک کی فقہ کو قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں از سرِنو مرتب کیا جائے۔

یہ انقلاب ہو تو بڑا انقلاب ہو

دارو کوئی سوچ انکی پریشان نظری کا

گورنمنٹ کالج (لاہور) کے میگزین — راوی — کی اکتوبر ۱۹۷۷ء کی اشاعت میں سالِ چہارم کے ایک طالب العلم — جاوید احمد — کا ایک مختصر سا مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے۔

مذہب اور مسرت

یہ مقالہ کسی ایک فرد کے خیالات کا آئینہ دار نہیں۔ یہ ترجمانی کرتا ہے ہمارے نوجوان طالب علموں کے اس گروہ کے خیالات کی (اور اس گروہ کی تعداد اب دن بدن بڑھتی جا رہی ہے) جو ہمارے مروجہ مذاہب سے بیزار ہو چکا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان میں سے بیشتر ابھی ان خیالات کو زبان پر لاتے ہوئے ہچکچاتے ہیں، اور جاوید صاحب نے انہیں برملا کہہ دینے کی جرأت کر لی ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر یہ مقالہ ہماری گہری توجہ کا مستحق ہے۔ اس کا رواں ترجمہ حسب ذیل ہے۔

مذہب اور مسرت

کسی بھی مذہب کا اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ مترشح ہوگا کہ اس میں کائنات اور اس کے خالق کی ماہیت، نوعِ انسانی کے مستقبل اور ایسے امور جو تعلیم سائنس سے ماورا ہیں، کے بارے میں ایک خاص عقیدہ یا تصور موجود ہے۔ ان میں زیادہ اہمیت کا حامل عقیدہ "متصورہ خالق" کا عقیدہ ہے۔ تہذیبِ انسانی کے آغاز سے ہی انسانیت گوناگوں مسائل سے دوچار رہی ہے۔ اور ان مسائل کو حل کرنے کی جستجو میں انسانی ذہن نے جن دیومالائی کہانیوں کو اختراع کیا، انہیں 'مذہب' کا نام دے دیا گیا۔ مذہب اس اعلیٰ ہستی کی پرستش کے گرد گھومتا ہے جسے قادرِ مطلق اور خالقِ کائنات تصور کیا جاتا ہے اور یہ گمان کیا جاتا ہے کہ اس کائنات کا مینجنگ ڈائریکٹر بھی وہی ہے۔

نوعِ انسانی کی اکثریت خدا پر یقین نہیں رکھتی ۔ اور اس الحاد کے نتیجہ میں وہ کوئی نمایاں پریشانیوں کا بھی شکار نظر نہیں آتی ۔ اگر خدا کہیں موجود بھی ہوتا تو یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اتنا نازک مزاج ہوتا کہ وہ اُن لوگوں سے ناراض ہو جاتا جو اس کے وجود کا اقرار نہیں کرتے اور انہیں پریشانیوں میں مبتلا کر دیتا ۔ آج کل چین اور روس کے عوام مذہبی ممالک کے عوام کی نسبت کہیں زیادہ خوش ہیں ۔

بنیادی طور پر مذہب 'خوف' پر مبنی ہے ۔ یہ 'خوف' کچھ تو عالمِ غیب کا خوف ہے اور کچھ یہ محسوس کرنے کی خواہش کہ ہمارا ایک بڑا بھائی موجود ہے جو ہر مشکل میں معاون و مددگار رہے گا ۔ اس طرح 'خوف' ہی مذہب کی اصل بنیاد ہے ۔ یعنی پُر اسرار قوتوں کا خوف، شکست کا خوف اور موت کا خوف ۔ لیکن سائنس نے اس 'خوف' کا خاتمہ کر دیا ہے اور ہم سائنس کی مدد سے اُس 'خوف' پر غالب آسکتے ہیں' جو صدیوں سے نوعِ انسانی پر نسل در نسل مسلط چلا آرہا ہے ۔ یا سائنس اور خود ہمارے دل و دماغ ہمیں سکھا سکتے ہیں کہ ہم خیالی سہاروں کی تلاش چھوڑ دیں اور آسمان پر اپنے رفقاء پیدا کرنے کی بجائے اس زمین کی طرف نگاہ دوڑائیں ۔ سائنس ہمیں سکھاتی ہے کہ ہم اس دنیا کو خوشگوار بنا کر اس میں رہیں اور اُس خیالی دنیا میں رہنے کا خیال چھوڑ دیں جس میں صدیوں سے مسجد و کلیسا کی طرف سے دودھ اور شہد کی نہروں کے وعدے کئے جا رہے ہیں ۔

مذہب کے پیروکار یہ بات کس طرح نظر انداز کر سکتے ہیں کہ جو لوگ ہمیشہ عالمِ غیب کے خوف میں مبتلا رہیں وہ کبھی خوش نہیں رہ سکتے ۔ مزید برآں خدا کے بارے میں اُن کا تصور ایک مطلق العنان آمر کا سا ہے ۔ اور اس قسم کا تصور ایک آزاد آدمی کے شایانِ شان نہیں ہو سکتا ۔

جب آپ لوگوں کو انتہائی ذلتِ نفس کے ساتھ خدا سے یہ دعا کرتے ہوئے سنتے ہیں کہ تو ہم گنہگاروں کو معاف کر دے تو یہ بات قابلِ نفرت معلوم ہوتی ہے اور اس سے انسانوں کی عزتِ نفس مجروح ہو جاتی ہے اس دنیا میں خوش رہنے کے لئے انسان کو حوصلے، شفقت اور علم کی ضرورت ہے ۔ اُسے اپنے ماضی پر ماتم کرنے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی اس بات کی ضرورت ہے کہ اُن مذہبی دیوانوں کے صدیوں پہلے کے کہے ہوئے الفاظ دہرا کر اپنی ذہانت کو پابہ زنجیر کر دیا جائے جو بذاتِ خود کبھی خوش نہیں رہے ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں مقید کر لیتے ہیں اور دنیوی خوشیوں سے احتراز برتتے ہیں ۔ صحراؤں اور پہاڑوں کی تنہائیوں میں بسیرا کرتے ہیں اور اپنے آپ کو زندگی کے آرام و آرائش اور اچھے دوستوں سے محروم کر لیتے ہیں اور اپنی زندگی اُس دائمی عذاب کی فکر میں ہلکان کر دیتے ہیں جو اُن کے غیر مذہبی اور گنہگار بھائیوں پر آئندہ زندگی میں نازل کیا جائے گا ۔ اُن پر ایک جنون طاری رہتا ہے جس کے باعث وہ نہ صرف خوشی سے محروم ہو جاتے بلکہ حوصلے کی قوت بھی اُن میں نہیں رہتی ۔

خوشی اور مسرت کے بغیر مذہب بے معنی سا معلوم ہوتا ہے۔ خوشی ہمارے گردوپیش میں جنم لیتی ہے اس کی آسمانوں سے خوشہ چینی نہیں کی جا سکتی۔ خدا اور حیات بعدالموت پر ایمان و ایقان اس بات کو ممکن بنا دیتا ہے کہ زندگی اتنی ہمت سے کم میں بسر کی جائے جتنی ہمت کی ضرورت غیر مذہبی انسانوں کو ہوتی ہے۔ نوجوانوں کی اکثریت کا مذہبی عقاید پر یقین، عمر کے اُس حصہ میں ختم ہو جاتا ہے جب مایوس ہو جانا بہت ہی آسان ہوتا ہے اور اس طرح انہیں اُن لوگوں سے کہیں زیادہ پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جنہیں کبھی مذہبی تربیت دی ملی ہو۔ اُس آدمی کا کردار کس قدر کمزور اور قابلِ نفرت ہے جو من گھڑت دیومالائی کہانیوں کی مدد کے بغیر زندگی کے خطرات کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس کی زندگی کا ایک گوشہ اس حقیقت کو ناگزیر طور پر محسوس کرتا ہے کہ یہ محض من گھڑت کہانیاں ہیں لیکن وہ ان پر اس لئے یقین رکھتا ہے کہ وہ اسے دلاسا دیتی رہتی ہیں۔ بایں ہمہ وہ اس خیال کا سامنا کرنے سے جی چراتا رہتا ہے۔ کیا اس بات میں کوئی شک و شبہ ہو سکتا ہے کہ ایسا انسان کبھی خوش و خرم نہیں رہ سکتا۔

کہا جاتا ہے کہ مذہبی لوگ بہ نسبت غیر مذہبی لوگوں کے زیادہ خوش و خرم ہوتے ہیں۔ یہ بات مجھے ایک قدیم مذہبی رسم کی یاد دلاتی ہے۔ وہ یہ کہ کلیسا نے غسل کرنے کی عادت کو اس وجہ سے معیوب قرار دے دیا کہ یہ جسم کو زیادہ دلکش بناتا ہے اور جو چیز جسم کو زیادہ دلکش بناتی ہے وہ گناہ کی طرف مائل کر دیتی ہے۔ اس طرح غلاظت کو بنظرِ استحسان دیکھا گیا اور یوں تقدس کی بو زیادہ تیز ہو گئی۔ سینٹ پال نے اعلان کر دیا کہ جسم اور لباس کی پاکیزگی، روح کو ناپاک بنا دیتی ہے۔ جوؤں کو خدا کے موتی قرار دیا گیا اور جوؤں سے بھرپور ہونا ایک مقدس آدمی کی لاینفک علامت قرار پا گیا۔ اس کا تصور کیا جا سکتا ہے کہ جوؤں سے لپا ہوا آدمی...... کتنا خوش و خرم ہوتا ہے۔"

یہ مقالہ جب ہمارے مولوی صاحبان کی نظر سے گزرے گا تو ان کے ماتھے پر سو سو شکنیں پڑ جائیں گی، چہرے کی رنگت لال پیلی ہو جائے گی، منہ سے جھاگ نکلنے لگے گی، ہزاروں صلواتیں مقالہ نگار کو سنائی جائیں گی۔ اور دس ہزار اس کالج کو جس کے میگزین نے اسے شائع کیا ہے۔ اور اگر ان کا تعلق جماعت اسلامی سے ہے تو ان کی دشنام طرازیوں کا انداز کچھ اس قسم کا ہو گا کہ یہ نتیجہ ہے اس خدا فراموش تہذیب کا جو ہمارے ارباب بست و کشاد کے اعصاب پر بُری طرح سوار ہے۔ یہ نتیجہ ہے ہماری جاہلیت آمیز تنقیدات کا جو جمِ غفیر خانوں میں جنم لیتی اور کلبوں میں پروان چڑھتی ہے۔ یہ نتیجہ ہے ان رقص و سرود کی محفلوں کا جن کا خود حکومت کے زیرِ سایۂ عاطفت اہتمام ہوتا ہے۔ یہ نتیجہ ہے سوشلزم کے پراپگنڈے کا جس میں مذہب سے تنفر اور سرکشی

کو تعلیم دی جاتی ہے۔ جو حضرات ذہنیت کے اعتبار سے مولوی لیکن وضع قطع اور تراش خراش کی رُو سے ماڈرن واقع ہوئے ہوں، وہ ایک خاص شانِ بے نیازی سے یہ کہہ کر آگے بڑھ جائیں گے کہ یہ اعتراضات عیسائیت پر تو عاید ہو سکتے ہیں، ہمارے مذہب پر نہیں۔ اور اس کے بعد مطمئن ہو جائیں گے کہ مسئلہ حل ہو گیا ہے۔

لیکن اگر آپ تعصبات سے خالی الذہن ہو کر، ٹھنڈے دل سے غور کریں گے تو اس حقیقت کے سمجھنے میں ذرا دقت نہیں ہوگی۔ کہ تہذیبِ حاضرہ کی جس قدر خرابیاں اوپر بیان کی گئی ہیں، وہ بجائے خویش کتنی بھی مبنی بر حقیقت کیوں نہ ہوں، ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے یہ رجحانات و خیالات ان کا نتیجہ نہیں۔ نہ ہی اس میں کوئی اصلیت ہے کہ یہ اعتراضات عیسائیت پر وارد ہوتے ہیں، ہمارے مذہب پر نہیں۔ ان خیالات و رجحانات کی بنیادی وجہ وہ خود ساختہ مذہب ہے جسے ہمارا قدامت پرست اسلام کے نام سے پیش کرتا ہے۔ اور قوم کی بدقسمتی ہے، جس کی تعلیم "اسلامیات" کے نام سے ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں دی جاتی ہے۔ اگر آپ کے بچے سکول جاتے ہیں تو آپ ان سے سنیئے گا کہ انہیں اسلامیات کے نام سے کیا پڑھایا جاتا ہے آپ خود دیکھ لیں گے کہ اس تعلیم میں ان تمام خیالات کے بیج موجود ہیں جن کا اظہار زیرِ نظر مقالہ میں کیا گیا ہے۔ — وہی توہم پرستانہ افسانے، خدا کے متعلق وہی مستبد آمر کا سا تصور — اخلاقیات کی ساری بنیاد "خوف" پر — مایوسی کے وقت وہی موہوم سہاروں کی تلاش — اور اس سے آگے بڑھ کر جب "روحانیت" کی دنیا کی طرف آیئے تو ہمارے ہاں کے "مقربین بارگاہِ خداوندی" کا وہی نقشہ جو عیسائی راہبوں کا تھا، بلکہ ان سے بھی زیادہ غلاظت آلود اور تعفن آمیز۔ ہم گزشتہ بیس سال سے مسلسل پکارتے چلے آرہے ہیں کہ ہمارے نصابِ تعلیم میں بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اگر ہم نے مذہب اور دنیاوی تعلیم میں موجودہ ثنویت کو برقرار رکھا۔ اور سکولوں اور کالجوں میں، مروجہ مذہب پر مبنی اسلامیات کی تعلیم دی، تو ہمارے آنیوالی نسل، مذہب سے سرکش ہو جائے گی۔ ہماری اس آواز پر کسی نے کان نہ دھرا۔ اور اس کا نتیجہ اب ہمارے سامنے آرہا ہے۔ اس طوفان کو نہ ملاّ کی جلال آمیز پیشانی کے شکن روک سکتے ہیں، نہ اس کے قہر آلود کفر و الحاد کے فتوے، نہ اس کے سامنے جماعتِ اسلامی کی سیاسی مصلحتیں بند لگا سکتی ہیں، نہ اسلامیات کے تعویذ۔ اس کا ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ کہ مذہبی اور دنیاوی تعلیم کی موجودہ ثنویت کو ختم کر کے، طالب علموں کو علومِ حاضرہ کی عام تعلیم دی جائے اور اس کے ساتھ قرآنی حقائق اس طرح پیش کئے جائیں کہ ان کا ذہن مطمئن اور قلب سکون آشنا ہو جائے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو جو آتشِ خاموش اس وقت ہمارے نوجوانوں کے دل میں سلگ رہی ہے، وہ ایک دن شعلہ جوالہ بن کر بھڑکے گی اور آپ کی کوئی مقدس آرزو اسے فرو نہیں کر سکے گی۔ خدا کرے، ہمارے اربابِ اقتدار ابھی اس "الارم" سے خطرہ کا احساس کر لیں۔

لیکن نظام تعلیم کی یہ تبدیلی، معلوم نہیں ہو یا نہ ہو۔ اور اگر ہو تو کب ہو، اس دوران میں ہم، عزیز جاوید احمد، اور ان دیگر نوجوانوں کو جن کے سینے اس قسم کے شکوک و شبہات کی آماجگاہ بن رہے ہیں، نہایت مشفقانہ مشورہ دیں گے کہ وہ ہمارے پاس آئیں اور دیکھیں کہ ان کے شکوک کا اطمینان بخش ازالہ ہو جاتا ہے یا نہیں! یہ نوجوان ہماری ملّت کی عزیز ترین متاع ہیں۔ اس لئے ہمیں بھی دل و جان سے عزیز ہیں۔ وہ ہمیں طعنہ زن ناصح نہیں، شفیق دوست پائیں گے۔ ہم ان کا انتظار کریں گے۔

کچھ کتابوں کی بابت

۱۔ ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے شائع شدہ کتابوں نے ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ کے قلب و دماغ میں صحیح قرآنی انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ یہی ہمارے لٹریچر سے مقصود ہے۔

۲۔ طلوع اسلام ایک مشنری ادارہ ہے اور اس کی قرآنی تحریک کے قیام اور فروغ کا دارومدار بیشتر انہی کتابوں کی آمدنی پر ہے اس لئے اس باب میں آپ کا تعاون خود اس تحریک کی تائید کا موجب بھی ہوگا۔

۳۔ کتابوں کا اشتہار آپ کو رسالے کے مختلف مقامات پر ملے گا۔ نیز رسالہ کے اندر ایک کارڈ چھپا ہوگا جس میں ان کتابوں کی فہرست درج ہوگی۔ اس سے آپ کتابوں کا انتخاب کر سکتے ہیں۔

۴۔ کتابوں کی فرمائش بھیجتے وقت ضروری ہے کہ آپ فرمائش کی مجموعی قیمت کا کم از کم دسواں حصہ بذریعہ منی آرڈر بھیج دیں۔ بقایا کا وی۔ پی آپ کے نام بھیجا جائیگا۔

۵۔ کتابوں پر ڈاک کا خرچ بہت پڑ جاتا ہے۔ اگر آپ اس خرچ کی بچت چاہتے ہیں تو اس کے لئے آپ ہمارے "پیشگی خریداروں" کے حلقہ میں شامل ہو جائیے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ آپ سو روپے کی رقم (یک مشت) پیشگی جمع کرا دیں۔ اس کے بعد جو کتاب آپ طلب فرمائیں گے آپکو بھیج دی جائے گی اور اس پر ڈاک کا خرچ ہم خود برداشت کرینگے۔ آپ کا حساب ہمارے ہاں باقاعدہ رہے گا اور زر پیشگی کے ختم ہونے پر (یا ساتھ کے ساتھ) آپ اس میں مزید پیسے جمع کرا دیں گے۔

۶۔ احتیاط کے باوجود حساب میں بعض اوقات غلطی ہو سکتی ہے اس لئے حساب فہمی میں ضبط و تحمل سے کام لینا چاہیئے۔ دانستہ بد معاملگی اس ادارہ میں کبھی نہیں ہوگی۔

والسلام۔ ناظم

سائنس اور ایمان بالغیب

وسط جنوری میں لاہور میں ایک مذاکرہ منعقد ہوا جس کا موضوع تھا "سائنس اور اسلام"۔ اس مذاکرہ کی کوئی تفصیلی روئداد اخبارات میں شائع نہیں ہوئی، البتہ پاکستان ٹائمز کے "زینو" نے (اس اخبار کی ۱۰ جنوری کی اشاعت میں) اس پر تبصرہ کیا جس سے معلوم ہوا کہ مذاکرہ میں اس اہم ترین موضوع پر نہایت سطحی سی گفتگو ہوئی۔ ہمارے ہاں بدقسمتی سے ہو یہ رہا ہے کہ مختلف ادارے اس قسم کے اجتماعات کا انتظام کرتے ہیں اور محض گرمیٔ سخن کے لئے، عنوانات ایسے تجویز کر دیتے ہیں جو اپنے اندر بڑی کشش اور جاذبیت رکھیں لیکن ان میں حصہ لینے والے یا تو علوم متعلقہ کے ماہر نہیں ہوتے، یا وہ (جیسا کہ "زینو" نے لکھا ہے) اس بحث کے لئے تیار ہو کر نہیں آتے۔ نتیجہ یہ کہ ایسے مذاکرات ذہنوں پر بڑا غلط اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر زیر نظر مذاکرہ کے موضوع ——— سائنس اور اسلام ——— کو لیجئے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ اس میں شرکت کرنے والے حضرات، ایک طرف علوم سائنس کے ماہر ہوں اور دوسری طرف حقیقی اسلام پر بھی ان کی نگاہ بڑی غائر اور عمیق ہو۔ اس کے بعد یہ ممکن تھا کہ مذاکرہ کوئی مثبت نتیجہ مرتب کر سکتا۔ لیکن جو کچھ "زینو" نے لکھا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ (سوائے ایک آدھ کے) شرکائے مذاکرہ نے، موضوع کے متعلق تو کوئی بنیادی بات نہ کی، البتہ اپنی اپنی پوزیشن کی مدافعت کرتے رہے۔

اس کے بعد، ۱۳ جنوری کے پاکستان ٹائمز میں، ڈاکٹر محمد عبدالحق صاحب کی طرف سے ایک خط شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے جو کچھ کہا ہے، اس کا ملخص یہ ہے کہ ہمیں "سائنس اور اسلام" کی بحث ہی نہیں چھیڑنی چاہیئے کیونکہ ان دونوں میں کوئی تعلق ہی نہیں۔ "زینو" نے اس خط کا نہایت اچھا تعاقب اپنے اس تبصرہ میں کیا ہے جو ۱۰ فروری کے پاکستان ٹائمز میں شائع ہوا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک دو ایک نکات ایسے ہیں جو مزید وضاحت چاہتے ہیں۔ ادران سطور کی تحریر کا جذبہ محرکہ یہی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے خط کے شروع میں لکھا ہے۔

لیکن یہ مناسب نہیں کہ ہم سائنس اور اسلام میں باہمدگر تعلق پیدا کرنے کی کوشش کریں کیونکہ اسلام کا مطالبہ یہ ہے کہ اس کے ماننے والے ایک فوق الفطرت حقیقت پر ایمان رکھیں جسے قرآن نے ایمان بالغیب کہہ کر پکارا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ایمان کا ترجمہ (FAITH) کیا ہے اور غیب کا ترجمہ (UN - SEEN) اور جو کچھ انہوں نے لکھا ہے اس کا مفہوم یہ ہے۔ کہ

(۱) سائنس صرف عالم محسوس (یا عالم مشہود) سے بحث کرتی ہے اور وہ اپنے ہر دعویٰ کو علم اور تجربہ کی بنیادوں پر پیش کرتی اور دلائل و براہین کی رو سے منواتی ہے۔ اس کے برعکس،

(۲) اسلام غیر مرئی حقیقتوں (عالم غیب) پر ایمان کی دعوت دیتا ہے۔ اور

(۳) ایمان سے مراد ہے پیش کردہ صداقتوں کو بلا علم و عقل صحیح تسلیم کر لینا۔

ہمیں افسوس ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی یہ بنیاد ہی غلط ہے اور اسے استوار کیا گیا ہے اسلام کے اس تصور پر جو (اقبالؔ کی اصطلاح میں) "ابلہانِ مسجد" کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے اور جسے بلا تنقید صحیح تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ یہ تصور قرآن کا پیش کردہ نہیں، انسانوں کے خود ساختہ مذہب کا وضع کردہ ہے اور جب اسلام کو (جو دین ہے) مذہب تصور کر لیا جائے تو اس میں اور دیگر مذاہب، مثل عیسائیت، یہودیت، ہندومت وغیرہ میں بنیادی طور پر کچھ فرق نہیں رہ جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے خط کے اخیر میں لکھا ہے کہ

اسلام ایک فوق الفطرت حقیقت پر ایمان کا مطالبہ کرتا ہے جو ایک عبد مومن (BELIEVER) کو جذباتی طور پر اس طرح متاثر کرتا ہے کہ وہ اس فوق الفطرت حقیقت کے حضور ایسی رسومات ادا کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے، جن پر دلیل و برہان کی رو سے تنقید نہیں کی جا سکتی۔

سب سے پہلے اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآن کریم کی رو سے "ایمان" کسی صداقت کو بلا سوچے سمجھے آنکھیں بند کر کے مان لینے کا نام نہیں۔ اس کے نزدیک، کسی دعوے کو علم و عقل کی رو سے پرکھ کر، قلب و دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ، علی وجہ البصیرت صحیح تسلیم کرنے کو ایمان کہتے ہیں۔ چنانچہ وہ مومنین کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ۔

اَلَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْهَا صُمًّا وَّ عُمْیَانًا ۔ (۲۵/۷۳)

یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے (اور تو اور) آیات خداوندی بھی پیش کی جاتی ہیں تو ان پر بھی اندھے اور بہرے بن کر نہیں گر پڑتے (انہیں عقل و فکر کی رو سے قبول کرتے ہیں)

وہ ارباب علم و عقل اور اہل ایمان کو مرادف المحض قرار دیتا ہے۔ جب کہتا ہے کہ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ الَّذِينَ آمَنُوا (۶۵/۱۰)۔ اے ارباب عقل و فکر یعنی اے ایمان والو! تم خدا کا تقویٰ اختیار کرو۔ فوق الفطرت حقیقتوں میں سب سے سرفہرست اللہ کی ہستی ہے۔ اس کے متعلق رسول اللہ سے کہا گیا کہ اعلان کر دو کہ أَدْعُوا إِلَى اللّٰهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي (۱۲/۱۰۸)۔ میں جو خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں تو علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتا ہوں۔ میں بھی ایسا کرتا ہوں اور میرے متبعین بھی ایسا ہی کرینگے۔ اب ظاہر ہے کہ جو دعوت علیٰ وجہ البصیرت دی جائے گی اسے بہر حال عقل و فکر اور دلائل و براہین کی رو ہی سے مانا جائے گا۔

فوق الفطرت (غیر مرئی) حقیقتوں میں دوسرا مقام حیات بعد الممات کا ہے، جسے آخرت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم میں ہے کہ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ - فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ - (۲/۲۱۹) اسی طرح خدا تمہارے سامنے واضح "علامات" لاتا ہے تاکہ تم دنیا اور آخرت میں غور و فکر کر سکو۔ (محسوس علامات سے غیر مرئی حقیقتوں تک کیسے پہنچا جاتا ہے، اس کے متعلق ہم ذرا آگے چل کر عرض کریں گے۔ سردست آپ یہ دیکھئے کہ) قرآن کریم نے دنیا کے محسوسات کے متعلق ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ "آخرت" کے متعلق بھی غور و فکر سے کام لینے کی تاکید کی ہے۔ لہذا، قرآن کی رو سے، آخرت پر ایمان بھی اندھی عقیدت کی بنا پر نہیں لایا جاتا۔ اس صداقت کو غور و فکر کے بعد تسلیم کیا جاتا ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے ایمان، کسی حقیقت کو بلا سوچے سمجھے اور بلا دلیل و برہان مان لینے کا نام نہیں۔ یہ علم و بصیرت کی بنا پر صداقت پر یقین محکم کا نام ہے۔ ایمان کا ترجمہ (FAITH) نہیں، (CONVICTION) کا لفظ اس کے مفہوم سے زیادہ قریب ہے۔ ہماری بنیادی غلطی یہ ہے کہ ہم قرآنی اصطلاحات کا ترجمہ انگریزی کے ان الفاظ سے کر دیتے ہیں جو اس لئے عیسائیت کے پیش کردہ تصورات کے لئے وضع کئے گئے تھے۔ اس سے قرآن کا سارا مفہوم بدل جاتا ہے۔ اور تو اور ہم نے اسلام کو بھی ایک (RELIGION) قرار دے رکھا ہے۔ حالانکہ اسلام (RELIGION) نہیں، دین ہے اور دین کے لئے انگریزی زبان میں کوئی لفظ نہیں۔

"ایمان بالغیب" میں دوسرا لفظ غیب ہے جس کا ترجمہ (UN - SEEN) کیا جاتا ہے قرآن کریم نے یہ لفظ (غیب)، مشاہدۃ کے مقابلہ میں استعمال کیا ہے۔ اس لئے غیب، نامشہود کو کہیں گے۔ لیکن

ناشہود کی دو شقیں ہیں۔ ایک تو وہ ناشہود حقیقتیں ہیں جو کبھی شہود ہو کر سامنے نہیں آسکتیں۔ جیسے ذات خداوندی۔ لیکن ناشہود کی دوسری قسم ایسی حقیقتیں ہیں جو اگر آج غیر شہود ہیں تو ہو سکتا ہے کہ کل کو جب انسان کا علم اور آگے بڑھے، وہ شہود ہو جائیں۔ مثلاً قرآن کریم، اقوام گزشتہ اور انبیائے سابقہ کے بعض حالات بیان کرنے کے بعد کہتا ہے کہ ذٰلِكَ مِنْ أَنبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ (۳/۴۳)۔ یہ وہ "غیب" کی خبریں ہیں جنہیں ہم نے تیری طرف وحی کیا ہے۔ نزول قرآن کے زمانے میں، تاریخ نے ہنوز ان واقعات پر پڑے ہوئے پردے نہیں اٹھائے تھے۔ اس لئے ان کا تعلق "غیب" سے تھا۔ ہو سکتا ہے کہ جب تاریخی انکشافات مزید ترقی کریں تو یہ واقعات تاریخ کے مشہود حقائق بن کر سامنے آجائیں۔ اس زمرہ میں فطرت کی وہ قوتیں بھی آجاتی ہیں جو ایک وقت میں ناشہود ہوتی ہیں لیکن جب علم انسانی آگے بڑھتا ہے تو وہ شہود ہو جاتی ہیں۔ ناشہود کے مشہود ہونے کا یہی وہ طریق ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کریم نے کہا ہے کہ

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ - (۴۱/۵۳)

ہم انہیں انفس و آفاق میں اپنی نشانیاں دکھاتے جائیں گے تاآنکہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ قرآن کا ہر دعوےٰ صداقت پر مبنی ہے۔

"غیب" کی ایک اور قسم بھی ہے جس کا سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔ طبیب آپ کو ایک نسخہ لکھ کر دیتا ہے جو بڑا اور اس کا تیار کرنا بھی بڑا وقت طلب ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایسے پرہیز تجویز کرتا ہے جن سے آپ کو اپنے آپ پر بڑی کڑی پابندیاں عاید کرنی پڑتی ہیں۔ آپ یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ اس نسخہ کے استعمال اور طبیب کی ہدایات پر عمل کرنے سے آپ کو شفا ہو جائے گی۔ لیکن اگر آپ کو طبیب کی صداقت پر ایمان ہے، تو آپ ان تمام مشقتوں کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ اس کے بعد، نتائج بتا دیں گے کہ حکیم صاحب نے جو کچھ کہا تھا، بالکل ٹھیک تھا۔ لہٰذا کسی فارمولا، کسی قانون، کسی ہدایت کے ان دیکھے نتائج پر یقین کرنے کا نام بھی ایمان بالغیب ہے۔ یہ غیب، نتائج سے مشہود بن جاتا ہے۔ دنیائے انکشافات کی ساری عمارت اسی ایمان بالغیب پر استوار ہوتی ہے۔

اب آئیے سائنس کی طرف۔ یہ کہنا بھی درست نہیں کہ

(۱) سائنس میں ایمان کو کوئی دخل نہیں۔ اور

(۲) سائنس کا تعلق صرف محسوسات (عالم شہود) سے ہے۔

علوم سائنس کی ساری بنیاد ان اساسی قوانین پر استوار ہوتی ہے جنہیں (AXIOMS) کہا جاتا ہے ۔ ان قوانین کے متعلق کوئی یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ کیوں ایسے ہیں، کائنات میں کیسے موجود ہیں اور کہاں سے آگئے ہیں۔ ان کے متعلق یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ موجود ہیں اور ایسے ہیں۔ انسان کو ان کا علم کیسے ہوا، اس کے متعلق مختلف نظریئے ہیں۔ ایک نظریہ کی رُو سے یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ یہ قوانین خود انسان کی فطرت کے اندر موجود ہیں۔ دوسرے نظریہ کی رُو سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ انسان نے تجربات کے بعد انہیں دریافت کیا ہے۔ یہ دریافت کیسے بھی ہوئے ہوں، یہ حقیقت ہے کہ ان کے ایسا ہونے کے متعلق کوئی دلیل یا توجیہہ پیش نہیں کی جا سکتی۔ بس یہ ایسے ہیں اور انہیں ایسا تسلیم کرنا ہوگا۔ ان قوانین پر ایمان لائے بغیر، سائنٹسٹ ایک قدم نہیں اٹھا سکتا۔

قانون کا سرچشمہ عالم نامشہود ہوتا ہے اور اس کے نتائج محسوسات کے پیکروں میں سامنے آتے ہیں اس لئے قانون پر ایمان، نامحسوسات پر ایمان لانا ہے۔ اور اب تو سائنس ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ جن چیزوں کو ہم محسوس شکل میں اپنے سامنے دیکھتے ہیں ان کی اصل و بنیاد غیر مرئی اور غیر محسوس دنیا سے تعلق رکھتی ہے۔ اب مادہ (MATTER) سمٹ کر توانائی محض (PURE ENERGY) بن کر رہ گیا ہے جو یکسر نامحسوس ہے سر آرتھر ایڈنگٹن ہمارے دور کا ایک عظیم عالم طبیعیات گزرا ہے۔ وہ اپنی کتاب (SCIENCE AND THE UN-SEEN WORLD) میں اسی باب میں لکھتا ہے۔

> میں نے ابھی ابھی عرض کیا تھا کہ سائنس کو اب اس امر پر اصرار نہیں رہا کہ حقیقت عبارت ہے محسوسیت سے۔ یوں بھی جہاں تک اس کے لغوی معنوں کا تعلق ہے، مادیت کا عرصہ ہوا خاتمہ ہو چکا ...... اب دنیائے سائنس کا رجحان اس طرف نہیں کہ ہر شے کو مادہ ہی کی ایک شکل قرار دیا جائے۔ مادہ کا رتبہ جہانِ طبیعیات سے بہت نیچے گر گیا ہے۔ اس کا رجحان یہ ہے کہ ہر شے کو قانونِ فطرت کے عمل درآمد ہی کی ایک شکل ٹھیرایا جائے اور قانون فطرت سے مراد کچھ ایسے قوانین ہیں جیسے ہندسہ، میکانیت اور طبیعیات میں رائج ہیں....
> ..... قانونِ سائنس کی یہی ہمہ گیر سیادت ہے جس کو آج کل مادیت سے تعبیر کیا جاتا ہے
>
> (ص ۳۲-۳۱)

لہٰذا سائنس کے متعلق یہ کہنا کہ اس کا تعلق عالمِ محسوسات سے ہے، ایک فرسودہ خیال ہے۔ سائنس، درحقیقت حصول علم یا ادراکِ حقیقت کے ایک خاص طریق کا نام ہے۔ اس طریق کی عمارت ان بنیادوں پر رکھی ہے کہ

(۱) یہ سارا سلسلۂ کائنات غیر متبدل قوانین کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔

(۲) محسوس اشیاء کے مطالعہ اور مشاہدہ سے ان قوانین کی صداقت کا علم حاصل ہو جاتا ہے۔ اور

(۳) جب اور جہاں ان قوانین پر عمل کیا جائے گا، وہی نتیجہ مرتب ہوگا۔

سائنس کی یہ بنیادیں خود قرآن کی مہیا کردہ ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (۴۵/۱۳)

کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اسے ہم نے تمہارے لئے قانون کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔

اب رہا ان قوانین کو دریافت کرنے کا طریقہ، تو اس کے لئے قرآن نے "علم" کو لائینفک قرار دیا ہے۔ علم کی (DEFINITION) اس کے نزدیک کیا ہے۔ یہ بڑے غور سے دیکھنے کی چیز ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۔ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ۔ (۱۷/۳۶)

جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگا کرو۔ یاد رکھو۔ تمہاری سماعت، بصارت، اور قلب، ہر ایک سے اس کی بابت پوچھا جائے گا۔

آپ سوچئے کہ کیا "علم" کی یہ (DEFINITION) بعینہٖ وہی نہیں جسے سائنس پیش کرتی ہے۔ سماعت و بصارت سے مراد ہیں انسانی حواس (SENSES)۔ ہمارے حواس، اشیائے کائنات کے متعلق معلومات (DATA) فراہم کرتے ہیں، اور انسانی قلب (MIND) ان معلومات سے نتائج اخذ کرتا ہے۔ اس کو سائنٹیفک طریق حصولِ علم کہا جاتا ہے۔ باقی رہا اس بات کا ٹسٹ کہ جس نتیجہ پر انسان پہنچا ہے وہ صحیح ہے یا غلط، تو قرآن نے اس کے لئے (PRAGMATIC TEST) تجویز کیا ہے۔ یعنی تم اس پر عمل کرو۔ نتائج خود بخود اس کی صحت وسقم کا ثبوت بہم پہنچا دیں گے۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا کہ دین کا پروگرام پیش کر دینے کے بعد آپ اپنے مخالفین سے کہہ دیجئے کہ اگر تم اس کی صداقت پر اس طرح یقین نہیں کرتے تو اس کا دوسرا طریق یہ ہے کہ

يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ ۔ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ (۶/۱۳۵)

اے میری قوم! تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کئے جاؤ۔ میں اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتا ہوں۔ نتائج خود بخود بتا دیں گے کہ انجام کس کا اچھا ہوتا ہے۔

آپ دیکھئے کہ کیا حصولِ علم کا یہ طریق، اور اس کی صحت کے پرکھنے کا یہ معیار، بعینہٖ وہی نہیں جسے آج سائنٹیفک طریقِ انکشافات کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن "علماء" کہتا ہی انہیں ہے جنہیں آج کی اصطلاح میں

(SCIENTISTS) سائنسدان کہا جاتا ہے۔ سورۃ فاطر میں ہے۔

> کیا تو نے اس پر غور نہیں کیا کہ خدا بادلوں سے بارش برساتا ہے تو اس سے انواع و اقسام کے پھل اور فصلیں اُگتی ہیں۔ پھر پہاڑوں پر غور کرو کہ ان کی چٹانوں پر کس طرح رنگا رنگ کے خطے ہوتے ہیں۔ کوئی سفید، کوئی سرخ، کوئی کالا بھجنگ۔
>
> اور اسی طرح انسانوں، مویشیوں اور دیگر جاندار مخلوق کی بھی کتنی ہی قسمیں ہیں۔ (یہ حقائق تو سب کے سامنے ہوتے ہیں لیکن) ان کی عظمت کے سامنے وہی لوگ جھکتے ہیں جو ان پر علم و بصیرت سے غور و خوض کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں "علماء" کہلانے کا حق حاصل ہے۔ (۳۵/۲۷-۲۸)

فطرت کے ان محسوس حقائق و شواہد کو قرآن نے "آیات" کہہ کر پکارا ہے اور اس میں ایک عظیم نکتہ پوشیدہ ہے۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ غیر مرئی اور غیر مشہود حقیقتیں محسوس طور پر ہمارے سامنے نہیں آسکتیں۔ ان کے ادراک کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ محسوس مظاہر (علامات) پر غور و فکر سے انسان غیر مرئی حقائق کے متعلق علم حاصل کرے۔ آپ رات کے وقت کسی صحرا میں کھڑے ہوں جہاں آبادی کا نام و نشان تک نہ ہو۔ آپ کو دور کہیں آگ نظر آئے۔ اس سے آپ اندازہ لگالیں گے کہ وہاں کوئی انسان ہے۔ آگ اور انسان میں بظاہر کوئی تعلق نہیں لیکن آگ علامت بنتی ہے اس امر کی کہ وہاں انسان ہے۔ اسی کو آیت کہتے ہیں۔ فطرت کے محسوس مظاہر آیات بنتے ہیں فوق الفطر نامشہود حقیقتوں کے۔ اسی سے ذہنِ انسانی کا رخ عالمِ مشہود سے عالمِ غیب کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

اب ایک قدم آگے بڑھیے۔ قرآن کہتا ہے کہ جس طرح طبیعی دنیا کے متعلق خدا کے مقرر کردہ اٹل قوانین ہیں، اسی طرح خود انسانی دنیا کے متعلق بھی غیر متبدل قوانین ہیں۔ جس طرح طبیعی دنیا کے قوانین کی پابندی سے تعمیری نتائج مرتب ہوتے ہیں اور ان کی خلاف ورزی سے تخریب ہوتی ہے، اسی طرح انسانی دنیا سے متعلق قوانین کے مطابق نظامِ معاشرہ متشکل کرنے سے انسانیت آگے بڑھتی ہے اور ان کی خلاف ورزی سے اس کا ارتقا رک جاتا ہے جس کا نتیجہ فساد ہوتا ہے۔ قوانینِ فطرت کی طرح، انسانی زندگی سے متعلق قوانین بھی، انسانوں کے خود ساختہ نہیں، خدا ہی کے متعین فرمودہ ہیں۔ چونکہ مشاہدہ، مطالعہ، اور تجربہ کی رُو سے قوانین کے انکشاف میں بڑا لمبا عرصہ درکار ہوتا ہے، اس لئے انسانی مشقت کو کم کرنے کے لئے، انسانی زندگی سے متعلق قوانین بذریعہ وحی عطا کر دیئے گئے۔ قوانینِ فطرت اور انسانی زندگی سے متعلق قوانین میں یہ فرق، صرف ان کے طریقِ تعلیم میں ہے۔ اس کے بعد دونوں کے سمجھنے اور پرکھنے کا طریقہ ایک ہی ہے۔ یعنی دونوں کو غور و فکر اور علم و بصیرت کی رُو سے سمجھا جاتا اور عملی نتائج کے ذریعے پرکھا جاتا ہے۔ مغرب کی غلط نگہی یہ تھی (اور ہے) کہ اس نے قوانینِ فطرت

کی اہمیت پر تو اس قدر زور دیا لیکن انسانی زندگی سے متعلق قوانین کو یکسر نظرانداز کر دیا، اور معاشرہ کو اپنے خودساختہ قوانین کے مطابق متشکل کرنا شروع کر دیا جس کا نتیجہ وہ جہنم ہے جس میں دنیا اس وقت مبتلائے عذاب ہے۔ قرآن نے قوانین فطرت اور انسانی زندگی سے متعلق قوانین دونوں کی اہمیت پر زور دیا۔ ان کے اس امتزاج کا نام الدّین ہے۔ ہم الدّین کی (DEFINITION) ان الفاظ میں کر سکتے ہیں کہ

> فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں مستقل اقدار خداوندی کے مطابق صرف کرنے کا نام الدّین ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ قوانین فطرت (علوم سائنس) اور مستقل اقدار (وحی) کو الگ الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اگر ان میں ثنویت (DUALITY) پیدا کر دی جائے تو اس کا جو نتیجہ مرتب ہوگا اسے قرآن کے الفاظ میں سنیئے۔ سورۃ بقرہ میں ہے۔

> کیا تم الکتاب (ضابطۂ قوانین) کے ایک حصہ پر ایمان لانا اور اس کے دوسرے حصہ سے انکار کرنا چاہتے ہو؟ یاد رکھو! تم میں سے جو بھی ایسا کرے گا اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ وہ دنیاوی زندگی میں ذلیل ہوگا اور اخروی زندگی میں شدید ترین تباہی میں مبتلا۔ (۲/۸۵)

سیکولر تصورحیات میں قوانین فطرت پر ایمان لایا جاتا ہے۔ اور مستقل اقدار سے کفر برتا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔

"مذہب" میں قوانین فطرت سے کفر برتا جاتا ہے اور (بزعم خویش) وحی خداوندی پر ایمان لایا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ بھی ظاہر ہے۔

اور دین میں قوانین فطرت اور مستقل اقدار خداوندی دونوں پر ایمان لایا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، اس کے لئے تاریخ کے اوراق کو چودہ سو سال پیچھے پلٹنا ہوگا۔

مغرب نے مستقل اقدار خداوندی کو فراموش کر رکھا ہے، اور مسلمان صدیوں سے "مذہب" کا پیرو بن چکا ہے۔ دین نہ وہاں ہے نہ یہاں۔ (یہ قرآن کی دفتین میں محفوظ ہے) جب تک انسان دین پر عمل نہیں کرتا، انسانیت تباہیوں سے نہیں بچ سکتی۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبال نے کہا تھا کہ

مغرب ز تو بیگانہ۔ مشرق ہمہ افسانہ
وقت است کہ در عالم نقش دگر انگیزی

اسلامک سوشلزم

اب سے کچھ عرصہ پہلے جب ہمارے ہاں "اسلامک سوشلزم" کی اصطلاح عام کی جانے لگی تھی تو ہم نے کہا تھا کہ ہمیں یہ اصطلاح استعمال نہیں کرنی چاہیئے. کیونکہ اس سے حامیانِ نظامِ سرمایہ داری کو، عوام کو دھوکا دینے کے لئے موقعہ مل جائے گا. چنانچہ یہی ہوا اور جس خطرہ کی ہم نے نشان دہی کی تھی وہ ابھر کر سامنے آنا شروع ہو گیا۔

خود سوشلزم کی اصطلاح کا بنیادی نقص یہ ہے کہ مختلف ممالک میں اس کا مختلف مفہوم لیا جاتا ہے. لیکن جب بلا تعینِ مفہوم، اس لفظ کا استعمال کیا جائے، تو اس سے مارکسی سوشلزم مراد لی جاتی ہے. مارکسی سوشلزم (ڈیلکٹیکل میٹریلزم) کے دو اجزا ہیں. ایک وہ فلسفۂ زندگی جس پر مارکس نے اپنے نظریۂ تاریخ کی بنیاد رکھی. اس فلسفہ کی رُو سے، خدا، وحی، حیاتِ آخرت سے انکار کیا جاتا ہے. اور زندگی کو محض طبیعی زندگی قرار دے کر اسے خالصۃً طبیعی قوانین کے تابع رکھا جاتا ہے. اس کا دوسرا جزو، وہ معاشرتی نظام ہے جس میں وسائلِ پیداوار افراد کی ملکیت میں رہنے کے بجائے، مملکت کی مشترکہ تحویل میں رہتے ہیں. جب سوشلزم کی اصطلاح استعمال کی جائے ـــــ اور اس سے مراد مارکسی سوشلزم لی جائے ـــــ تو اس میں ان ہر دو اجزاء کو ساتھ رکھا جاتا ہے یعنی مارکسی فلسفۂ زندگی کو اُس کے معاشی نظام سے الگ نہیں کیا جاتا۔

سوشلزم کے اس تصور کو پیشِ نظر رکھنے سے یہ حقیقت نمایاں طور پر سامنے آجاتی ہے کہ "اسلامک سوشلزم" کی اصطلاح جمع بین النقیضین (یعنی دو متضاد چیزوں کو یکجا کرنے کے مرادف) ہے. کیونکہ اسلام کا فلسفۂ حیات سوشلزم کے فلسفۂ حیات سے یکسر متضاد ہے. اس سے نظامِ سرمایہ داری کے حامی، ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں. وہ کہتے ہیں کہ سوشلزم میں خدا، وحی، آخرت، سب کا انکار ہوتا ہے. ایسا مسلک اسلامی کیسے ہو سکتا ہے؟ ان کا یہ اعتراض بڑا وزنی ہوتا ہے اور عوام کو فوراً متاثر کر دیتا ہے اور یوں وہ نظامِ سرمایہ داری کی جڑیں مضبوط کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

لہٰذا، سوشلزم کی اصطلاح، خواہ اسے تنہا استعمال کیا جائے یا اسلام کے ساتھ ملا کر، غلط فہمیاں پیدا کرنے کی موجب ہو سکتی ہے۔ اس سے اجتناب لازم ہے۔ قرآن کریم نے جو معاشی نظام پیش کیا ہے وہ سوشلزم کے معاشی نظام سے بھی کہیں آگے چلا جاتا ہے۔ کمیونزم کے نظام میں (جو سوشلزم کی انتہائی شکل ہے) قرآنی نظام سے مماثلت پائی جاتی ہے۔ لہٰذا، قرآن کے معاشی نظام میں سوشلزم کا معاشی نظام تو آجاتا ہے لیکن اس کا خدا فراموش فلسفۂ حیات ساتھ نہیں آتا۔ اس لئے نظامِ سرمایہ داری کے حامیوں کو وہ غلط فہمیاں پھیلانے کا موقعہ نہیں مل سکتا جو سوشلزم (یا اسلامک سوشلزم) کی اصطلاح استعمال کرنے سے مل جاتا ہے۔ ہم نے اسی لئے، قرآن کے معاشی نظام کے لئے، قرآنی تصور کے مطابق، 'نظامِ ربوبیت' کی اصطلاح اختیار کی تھی۔ اس پر وہ اعتراضات وارد نہیں ہو سکتے جو سوشلزم کے فلسفۂ حیات کی رُو سے وارد ہوتے ہیں۔

——— (•) ———

چونکہ نظامِ سرمایہ داری دنیا میں بے حد بدنام ہو چکا ہے اور اس کا رسوائے عالم "مداری" تماشہ دکھا کر اپنی بساط سمیٹ رہا ہے، اس لئے اس کے مسلمان حامی (مسلمان اور نظامِ سرمایہ داری کے حامی! یا للعجب!!) کھلے بندوں تو اس نظام کی حمایت نہیں کر سکتے۔ اس کے لئے وہ ٹیکنیک یہ استعمال کرتے ہیں کہ "اسلام نہ نظامِ سرمایہ داری کا حامی ہے نہ سوشلزم کا۔ وہ ان کے بین بین اعتدال کی راہ دکھاتا ہے جس میں ان دونوں نظاموں کی خرابیاں دور ہو جاتی ہیں"۔ اس تمہید کے بعد، وہ پورے کے پورے نظامِ سرمایہ داری کو پیش کر دیتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ "زکوٰۃ، خیرات، انفاق فی سبیل اللہ" جیسی اصطلاحات چپکا کر اس نظام کو، جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا، عین اسلام بنا کر دکھا دیتے ہیں۔ اگر کوئی شخص دیانت داری سے سرمایہ داری نظام کو بہترین معاشی نظام سمجھتا ہے تو اسے ایسا سمجھنے کا حق حاصل ہے۔ لیکن جو شخص نظامِ سرمایہ داری کا حامی ہے لیکن اسے نظامِ سرمایہ داری کہنے کی جرأت نہیں کرتا اور اس پر صدقہ اور خیرات کی شکر چڑھا کر اسے عین اسلام کہہ کر پیش کرتا ہے، وہ منافقت برتتا ہے اور اسلام اور معاشرہ دونوں کے لئے تباہی کا موجب بنتا ہے۔

آپ ذرا اس عبارت پر غور کریں۔

آخری چیز ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ایسی باتیں سوچ بھی نہیں سکتے۔

اس کے ساتھ یہ الفاظ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

> سب سے پہلی چیز جو تمام اصلاح طلب عناصر کو صاف صاف سمجھ لینی چاہیئے، وہ یہ ہے کہ ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنانے کا تخیل بنیادی طور پر اسلام کے نقطۂ نظر کی ضد ہے۔

(یہ اقتباسات ہیں، مودودی صاحب کی کتاب "مسئلہ ملکیت زمین" کے صفحات (ص۱۰-۱۲) اور ص۲۸ کے)۔

آپ نظامِ معیشت کے اس تصور کو سامنے رکھیئے اور پھر سوچئے کہ کیا اس میں اور نظامِ سرمایہ داری میں کچھ بھی فرق ہے؟ لیکن اس نظام کو پیش کرنے کے بعد یہ کہنا کہ ہم نظامِ سرمایہ داری کے مخالف ہیں، ابلہ فریبی نہیں تو اور کیا ہے؟ اگر یہ جرأت سے کہیں کہ ہمارے نزدیک اسلام، نظامِ سرمایہ داری کا حامی ہے تو ان کے متعلق یہ کہا جاتے گا کہ انہوں نے اسلام کو صحیح طور پر نہیں سمجھا۔ لیکن نظامِ سرمایہ داری کی حمایت کر کے، یہ دعوےٰ کرنا کہ ہم اس نظام کے مخالف ہیں، کھلی ہوئی فریب دہی ہے جسے وہی لوگ اختیار کر سکتے ہیں جن کے نزدیک "زندگی کی ضرورتوں کے لئے جھوٹ بولنا شرعاً واجب ہو جاتا ہے"۔

اسلام کو نظامِ سرمایہ داری کے خلاف ظاہر کرنے کے لئے ایک دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اسلام میں ہر شے پر ملکیت کا اصلاً حق خدا کا ہوتا ہے، افراد کا نہیں۔ آپ سوچئے کہ محض عقیدۃً (یعنی لفظی طور پر) یہ کہنا کہ ہر شے کا مالکِ حقیقی خدا ہے، اور عملاً ہر شے پر اپنا وہ اختیار و اقتدار رکھنا جو ایک مالک کو حاصل ہوتا ہے، اسلام سے مذاق کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟ آپ نے اکثر مکانوں کے ماتھے پر اس قسم کی الواح دیکھی ہونگی کہ

درحقیقت، مالکِ ہر شے خدا است
ایں امانت چند روزہ نزدِ ما است

مکان کے اوپر لکھا تو ہوگا یہ، لیکن عملاً اس کے پورے حقوقِ ملکیت اپنے پاس ہوں گے اور زندگی بھر خدا کے حقِ ملکیت کا کوئی ادنےٰ سا مقام بھی نہیں آنے کا۔ حتےٰ کہ یہ "چند روزہ امانت" مرنے کے بعد اپنی اولاد کی ملکیت میں دے دی جاتے گی۔ قومیں اُس وقت تباہ ہوتی ہیں جب ان کے عقیدہ اور عمل میں اس قدر تضاد واقع ہو جاتے۔ خدا نے جب یہ کہا کہ ان چیزوں کے مالک ہم ہیں تو عملی زندگی میں اس کا مفہوم یہی ہے کہ یہ افراد کی ملکیت میں نہیں جا سکتیں۔ یہ تمام نوعِ انسان کے مشترکہ مفاد کے لئے کھلی رہنی چاہئیں۔ یہی وہ عظیم حقیقت تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

باطنِ "الْاَرْضُ لِلّٰہ" ظاہر است
ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند، کافر است

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے رزق کے سرچشموں پر حقوقِ ملکیت کے دعویداروں کو "اَنْدَادًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ" کہا ہے۔ یعنی خدا کے ہمسر۔ (۲/۲۲)۔

--- (٠) ---

آج کل اس سلسلہ میں ایک اور دلیل دی جاتی ہے۔ اور وہ یہ کہ "اسلام نے ذاتی ملکیت (PRIVATE - PROPERTY -) کی اجازت دی ہے اور سوشلزم میں ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ اس لئے سوشلزم اسلام کے خلاف ہے"۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ ان حضرات کو پرائیویٹ پراپرٹی اور پرسنل پراپرٹی کا فرق بھی معلوم نہیں۔ پرائیویٹ پراپرٹی سے مفہوم ہوتا ہے وسائل رزق کو ذاتی ملکیت میں دے دینا۔ اور پرسنل پراپرٹی سے مراد ہوتی ہے روزمرہ کی اشیائے مستعملہ کو افراد متعلقہ کی ملکیت میں دے دینا۔ پرسنل پراپرٹی کی تو سوشلزم میں بھی اجازت ہوتی ہے۔

جہاں تک پراپرٹی پر ملکیت کی اجازت کا تعلق ہے، اس کی تصریح تو قرآن میں کہیں نہیں کی گئی لیکن آپ اسے خیرات، وراثت وغیرہ سے متعلق ہدایات سے مستنبط کیا جا سکتا ہے۔ اسے تسلیم کرنے کے بعد آپ ان کی اس دلیل کی طرف آیئے۔ یہ یہی کہتے ہیں کہ "اسلام میں پرائیویٹ پراپرٹی کی اجازت ہے"۔ یہ نہیں کہتے اور نہ ہی ایسا کہہ سکتے ہیں، کہ اسلام میں پرائیویٹ پراپرٹی کا حکم ہے۔ آپ غور فرمائیے کہ جس چیز کی کسی کو اجازت حاصل ہو، وہ اگر اس اجازت سے فائدہ اٹھانا نہ چاہے تو یہ کون سا جرم ہوگا؟ قرآن کی رو سے تمام حلال چیزوں کے کھانے کی اجازت ہے۔ اب اگر کوئی شخص ان حلال اشیا میں کسی چیز کو کسی وجہ سے نہیں کھانا چاہتا، تو کیا اسے جرم قرار دیا جائے گا؟ پرائیویٹ پراپرٹی کی اجازت سے تو سب سے پہلے خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہی فائدہ نہیں اٹھایا تھا حضورؐ کی کوئی ذاتی جائیداد نہیں تھی، نہ ہی کبھی آپ نے مال جمع کیا۔ وفات کے وقت گھر میں چند دینار تھے۔ انہیں بھی حضورؐ نے ضرورت مندوں کے لئے بیت المال میں بھجوا دیا تھا۔ آپ نے اپنے ترکہ میں بھی نہ دولت چھوڑی تھی نہ جائیداد۔ خدا نے ہمارے لئے حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کو اسوۂ حسنہ (بہترین ماڈل) قرار دیا ہے؟ یہ بہترین ماڈل تو ہمیں یہی بتاتا ہے کہ نہ مال جمع کرنا چاہیئے نہ جائیداد اکھٹی کرنا۔

اس پر یہ لوگ کہہ دیتے ہیں کہ بے شک ایک شخص اپنی مرضی سے ایسا کر سکتا ہے کہ وہ کسی اجازت سے فائدہ نہ اٹھائے لیکن حکومت ایسا حکم نافذ نہیں کر سکتی، جو اس کی اجازتوں پر پابندی لگا دے؟ اس سلسلہ میں ان کی پہلی غلط نگہی یہ ہے کہ یہ اسلامی حکومت کو بھی دنیا کی عام حکومتوں کی طرح مستبد حکومت سمجھتے ہیں جو رعایا پر حاکم ہوتی ہے اور اس سے اپنی من مانی منواتی ہے۔ اسلامی حکومت، مسلمانوں کی رضا و رغبت سے قائم ہوتی ہے اور اس کے فیصلے خود ملت کے فیصلے ہوتے ہیں۔ اس میں حاکم و محکوم اور رعیت و حکومت کا کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ وہ حکومت، ان قوانین خداوندی کے نفاذ کی مشینری ہوتی ہے جن کی اطاعت تمام مسلمان اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔ لہٰذا، اس حکومت کے فیصلے مستبد آمر کے فیصلے نہیں ہوتے۔ یہ تو اس اطاعت کی تنظیمی

شکل ہوتی ہے جسے امت نے بہ طیب خاطر اپنے ایمان کی حیثیت سے قبول کیا ہوتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ حکومت اجتماعی مصالح کے پیشِ نظر کسی "اجازت" پر پابندی لگا سکتی ہے؟ یا دنے تدبر یہ بات سمجھ میں آ جائے گی کہ حکومت کا ایسا فیصلہ قطعاً اسلام کے خلاف نہیں کہلا سکتا۔ (مثلاً) ہمیں (حلال) ذبیحہ کے گوشت کھانے کی ہر وقت اجازت ہے لیکن حکومت نے آج کل "مصالح ملکی کی خاطر" یہ پابندی لگا رکھی ہے کہ ہفتے میں دو دن گوشت نہیں کھایا جائے گا۔ کیا آپ اس پابندی کو خلافِ اسلام قرار دیں گے؟ یہ تو پھر بھی ہفتے میں دو دن کے ناغے کی بات ہے، حضرت عمرؓ کی تو یہ کیفیت تھی کہ وہ اگر کسی شخص کو دو دن متواتر گوشت خریدتے دیکھتے تو اسے یہ کہہ کر ڈانٹ دیتے کہ تو اپنے پڑوسی اور دوسرے بھائیوں کے لئے کفایت سے کیوں کام نہیں لیتا۔ (بحوالہ تاریخ عمر۔ ابن جوزی)۔ خدا نے مسلمانوں کو اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت دی ہے لیکن تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ بعض سیاسی مصلحتوں کے پیشِ نظر حضرت عثمانؓ (یا حضرت علیؓ) نے ان کے ساتھ نکاح کرنے کو روک دیا تھا۔ اس سلسلہ میں عراق کی زمینوں کے معاملہ کو بھی سامنے لایئے۔ مملکت کے سربراہ کو اس کی اجازت تھی کہ وہ مالِ غنیمت کو سپاہیوں میں تقسیم کر دے۔ اور رسول اللہ اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں اس پر عملدرآمد بھی ہوتا رہا۔ لیکن جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں عراق کی مزروعہ زمینیں فتح ہوئیں تو آپ نے (متواتر ایک ماہ کے غور و خوض اور باہمی مشاورت کے بعد) یہ فیصلہ کر دیا کہ زمینیں سپاہیوں کی ذاتی ملکیت میں نہیں دی جا سکتیں۔ یہ مملکت کی مشترکہ تحویل میں رہیں گی۔ تاکہ موجودہ اُمت اور آنے والی نسلوں کا اجتماعی مفاد محفوظ رہے۔ کیا اس فیصلے کو آپ اسلام کے خلاف قرار دیں گے؟ بنابریں، اگر آج کوئی اسلامی مملکت یہ فیصلہ کرتی ہے کہ وسائلِ پیداوار پر ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی تو اسے کس طرح خلافِ اسلام ٹھہرایا جائے گا۔

(۰)

یہ ہے اس "اجازت" کی کیفیت جس کے سہارے اسلام کا وہ نظام پیش کیا جاتا ہے جس کی ایک جھلک مودودی صاحب کی کتاب کے ایک اقتباس سے دکھائی جا چکی ہے۔ وہ اسلام، جس میں انبار در انبار دولت جمع کرنے اور قطار در قطار جائیدادیں کھڑی کرنے پر کسی قسم کی کوئی پابندی عاید نہیں کی جا سکتی، جس میں کسی کو نقد روپیہ بطور قرض دے کر اس پر سود لینا تو حرام ہوتا ہے لیکن اسی روپے سے زمین خرید کر اسے بٹائی یا نقد پٹے پر دے دینا، یا اس روپے سے ایک عمارت کھڑی کر کے اس کا کرایہ وصول کرنا، یا اسے کسی دکاندار کو دے کر اس کے منافع میں شریک ہوتے رہنا، حلال و طیب قرار پاتا ہے۔ اور یہ اس قرآن کی موجودگی میں کیا جاتا ہے جس میں بیسیوں مقامات پر دولت جمع کرنے کو جہنم کی آگ بتایا گیا ہے جس میں بہ نصِ صریح کہا گیا ہے کہ کوئی شخص

اپنی بنیادی ضروریات سے زائد روپیہ (SURPLUS MONEY) اپنے پاس نہیں رکھ سکتا جس میں مترفین (دوسروں کی کمائی پر عیش اڑانے والوں) کو بدترین مجرم قرار دیا گیا ہے۔

اس مقام پر اسے بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ اسلامی نظام میں، رزق کے سرچشمے، اور وسائل پیداوار، انفرادی ملکیت کے بجائے حکومت کی تحویل میں رہتے ہیں۔ اور اپنی بنیادی ضروریات سے زائد روپیہ اس کے خزانۂ عامرہ میں چلا جاتا ہے، تو اس سے مقصود کیا ہے؟ اسلامی نظام کی رُو سے حکومت، تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ وہ اس فریضہ سے عہدہ برآ ہو نہیں سکتی جب تک وسائل پیداوار اس کی تحویل میں، اور افراد کی زائد از ضروریات آمدنی اس کے حیطۂ اقتدار میں نہ ہو۔ اسلامی حکومت کی اس ذمہ داری کی نوعیت کیا ہوتی ہے، اس کا اندازہ نبی اکرمؐ کے اس ارشادِ گرامی سے لگائیے جس میں آپؐ نے فرمایا کہ۔

> جس بستی میں کوئی ایک شخص بھی رات کو بھوکا سو گیا اس سے خدا اپنی حفاظت کی ذمہ داری واپس لے لیتا ہے۔

یہ تھا اسلام کے معاشی نظام سے مقصود۔ اب آپ خود ہی فیصلہ کر لیجئے کہ یہ مقصد قرآن کے نظامِ ربوبیت سے حاصل ہو سکتا ہے یا اس نظام سے جس میں ہر شخص کو کھلی چھٹی دے دی جاتے کہ وہ جس قدر جی چاہے، دولت سمیٹتا چلا جاتے۔ اور اس دولت کے بل بوتے پر رزق کے سرچشموں اور پیداوار کے وسائل پر سانپ بن کر بیٹھ جاتے۔

———(٥)———

یہ تو رہے ہمارے "ابلہانِ مسجد"۔ دوسری طرف ہمارے "تہذیب کے فرزندوں" کی بھی عجیب حالت ہے۔ ان کی طرف سے اس قسم کے سلوگن پیش ہوتے رہتے ہیں کہ:۔

(۱) ہمارا سیاسی نظام — جمہوریت

(۲) ہمارا معاشی نظام — سوشلزم

(۳) ہمارا مذہب — اسلام

سمجھ میں نہیں آتا کہ جب سیاسی نظام اور معاشی نظام، مذہب کے بغیر ہی قائم ہو جائیں گے تو پھر مذہب — یہ تختۂ مسجد — کس مرض کی دوا ہوگا! سچ کہا تھا اقبالؒ نے کہ:

ﷺ سنے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند۔	(اقبالؒ)

نہ دیر میں نہ حرم میں خودی کی بیداری

یاد رکھئے۔ دنیا کی نجات صرف اس سوسائٹی کے ہاتھوں ممکن ہے جو اس نعرہ کو لے کر اٹھے کہ :

(۱) ہمارا سیاسی نظام وہ جمہوریت ہوگی جس میں تمام امور خدا کی کتاب کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے امت کی باہمی مشاورت سے طے پائینگے ۔ اور

(۲) ہمارا معاشی نظام وہ ہوگا جس میں ہر فرد پوری پوری محنت کرے گا اور اس کی محنت کا ماحصل قرآن کی مستقل اقدار کے مطابق، تمام نوعِ انسان کی مرفہ الحالی کے لئے کھلا ہوگا ۔

اس سوسائٹی کا نام اُمتِ مسلمہ یا جماعتِ مومنین ہوگا اور اس کے اس نظام کو الدّین کہا جائے گا ——

اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است !

* * *

پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

پرویز صاحب کا سابقہ درسِ قرآن کریم مسلسل آٹھ سال کے بعد گزشتہ جنوری میں تکمیل تک پہنچ گیا تھا جس کی تقریب ۷ر جنوری کو منائی گئی تھی۔ سامعین کے شوقِ بے پایاں اور اصرارِ بے حد کے پیشِ نظر، پرویز صاحب اس سلسلہ کو از سرِ نو شروع کرنے پر رضامند ہو گئے ہیں ——— چنانچہ

اس سلسلۂ زریں کا آغاز

۷ ر مارچ (بروز اتوار) صبح ۹ بجے

حسبِ سابق ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ میں کیا جائیگا !

چونکہ ابتدائی درس خاص طور پر اہم ہوتے ہیں، اس لئے درس سے دلچسپی رکھنے والے احباب کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان میں التزاماً شریک ہوں۔

نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام۔ لاہور

خورشید عالم

برطانیہ کا عالمی کردار

•خلاء کے عالمی کردار کے مطالعہ (طلوعِ اسلام فروری ۱۹۶۸ء) کے بعد برطانیہ کے مطالعہ تک آنا نظر بظاہر اوج سے پستی کی طرف آنا ہے۔ یہ اندازِ گفتگو کا دھوکا ہے۔ استعمارِ فرنگ نے "ییکے بالا و پست" کا ایسا مظاہرہ کیا ہے کہ بات رہنے زمین کی ہو یا پہنائے افلاک کی، کردار یکساں طور پر پستیٔ فطرت ہی کا نمونہ ہوگا۔ خلاء کی بلند بامی، استعمار کی بلند نامی کا موجب نہ ہوئی نہ ہو سکتی ہے۔ افرنگ اس زینے کے کسی پائے پر ہی کیوں نہ کھڑا دکھائی دے اس سے نہ رفعتِ درجہ کا اندازہ ہوگا، نہ کیف وکمِ استعمار میں کوئی کسی قسم کا فرق واقع ہوگا۔ نفسِ بلبل ہو یا نکہتِ گل، بات ایک ہی ہوگی اور یہ جلوہ سامانی ہوگی استعمارِ فرنگ کی۔ اس استعمار کا مطالعہ پچھلی کئی قسطوں میں مسلسل کیا جاتا رہا ہے۔ صرف عنوان مختلف تھے داستان ایک ہی تھی۔ اقوامِ یورپ میں کبھی برطانیہ بطورِ خاص استعمارِ فرنگ کا مظہر تھا، ہمیں بھی اسی پیکرِ استعمار سے واسطہ پڑا۔ اس اعتبار سے استعمارِ فرنگ کے وسیع پس منظر میں برطانیہ کا جائزہ ضرورت کے مطابق اقساطِ ماسبق میں بھی آ چکا ہے۔ اس جائزے کے بعد علیحدہ عنوان کے تحت مزید جائزے کی ضرورت تو نہیں ہونی چاہیئے تھی لیکن اب ایسے کوائف واحوال منظرِ عام پر آنے لگے ہیں جن سے برطانیہ کا جداگانہ مطالعہ بین الاقوامی سیاست کے بنیادی اور تغیر پذیر تقاضوں کو سمجھنے کے لئے ضروری ہو گیا ہے۔

اقوامِ یورپ نے اپنے گھروں سے نکل کر تاریخِ انسانیت میں وحشت و بربریت کی طرح ڈالی اور عہدِ یورپ کا آغاز کیا۔ برطانیہ بوجوہ ان میں بازی لے گیا اور ایک ایسی سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا جس پر، بقول اس کے نقیبوں اور مستادوں کے، 'سورج غروب نہیں ہوتا تھا'۔ اس عجیب الخلقت، غریب الہیئت اور کریہ المنظر جسدِ استعمار کو اس نے تہذیب، شرافت اور ترقی کا مجسمہ قرار دیا اور قلم اور تلوار دونوں کے زور سے دنیا بھر سے منوانے کی سعی میں لگا رہا۔ اس عہد کا دل انگلستان تھا۔ انگلستان کا دل لندن تھا اور لندن کا دل دریائے ٹیمز تھا۔ انگریز نے یوں جھوم جھوم کے ان کے گیت گائے اور مغلوب اقوام کو سنائے اور رٹائے کہ یہ نام افسانوی تصورات اور خلد آشیانی مقامات بن کر قلوب و اذہان پر چھا گئے[1]۔ یہ جادو ڈھائی تین سو سال تک چلتا رہا اور پوری طرح اب بھی نہیں ٹوٹا حالانکہ مشیت

---

[1] صفحہ آئندہ پر ملاحظہ ہو۔

نے اس کا تار و پود بکھیرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ اور اب وہ اس قبا کو قریباً تار تار کر چکی ہے۔

استعمارِ فرنگ پر ان صفحات میں اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے، اس میں برطانیہ کا نام آیا تو، اور نہیں آیا تو، وہ سلسلے کا سارا اس پر صادق آتا ہے۔ برطانیہ نے جن اقوام پر تسلط حاصل کیا، ان کا ظاہر و باطن بدلنے میں اس نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ یورپ کو بالعموم اور برطانیہ کو بالخصوص تاریخی، سیاسی، ثقافتی، علمی، معاشی، معاشرتی اور تکنیکی، ہر لحاظ سے برتر کہا اور کہلوایا گیا۔ برتری کی داستانیں وضع کی گئیں اور شریکِ نصاب کرکے درس گاہوں میں ازبر کرائی گئیں۔ وہ سرچشمے پاٹ دیئے گئے جن سے مشرق کی عظمتِ رفتہ کے تصور کی آبیاری ہو سکتی تھی۔ ان میں دجل و تلبیس کا ایسا زہر بھر دیا گیا کہ نہ کھیتی میں سبزہ رہا اور نہ جنگل میں کھیت بچے۔ انگریز کا واسطہ خاص طور پر اقوامِ مسلمہ سے پڑا۔ ان کا تاریخی ورثہ اور تشخص ختم کرنے میں وہ مسلسل کوشاں رہا۔ انہیں بتایا گیا، پڑھایا گیا اور سوال پوچھ پوچھ کے اور مطلب کے جوابات حاصل کر کر کے، اس میں شبہ کی گنجائش تک نہ رہنے دی گئی کہ تاریخِ عالم میں مسلمانوں کا دور ایک تاریک باب ہے۔ نورِ علم کی جو کرن یونان سے پھوٹی[1] وہ مطلعِ یورپ پر درفشاں آفتاب بن کر نمودار ہوئی۔ مسلمان رات کے اندھیرے میں آئے اور چلے گئے۔ انہوں نے نور کی جھلک دیکھی بھی تو صبحِ کاذب کی حد تک۔ دورِ یونان اور عہدِ یورپ کے درمیان ٹکریں مارنے سے کوئی شکستہ پل نظر آ بھی جاتا تھا تو اس کے بکھرے ٹوٹے پتھروں کو جوڑ کر اسلام اور مسلمان کا نام ابھارنا جان جوکھوں کا کام ہوتا تھا۔ یہ کام کوئی کر بھی لیتا تھا تو دوسرے یقین نہیں کرتے تھے۔ استعمار کے اس اتھاہ سمندر میں ڈوب کر ابھرنا اسلام اور مسلمان کی قوتِ احیاء و نمو کا ناقابلِ یقین اور ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔

برطانیہ کا عروج مسلمانوں کا زوال تھا۔ دونوں ہی انتہا تک پہنچے اور تاریخ کے ناطق فیصلے دکھائی دینے لگے۔ پاؤں رکاب سے نکل چکے تھے اور عنان ہاتھ سے چھوٹی جا رہی تھی کہ "۔۔۔ یکایک ہوئی غیرتِ حق میں حرکت ۔۔۔" سرسید، افغانی، اقبال، انجم بجز بیباں اور خورشید بداماں اٹھے اور شبِ تار کے سینے سے مطلعِ تاباں کے پھوٹنے کے یقینی آثار پیدا ہو گئے۔ استعمار سے گلو خلاصی کرانے اور اپنے آپ میں آنے یا آتے چلے جانے کی داستانِ طویل و صبر آزما سے صرفِ نظر کرکے ۔ کہ وہ ایک علیحدہ موضوع ہے، دیکھا جائے تو انگریز پہلی جنگِ عظیم سے ایک فاتح اور برتر قوت کی حیثیت سے ابھرا۔ گو اس کی جیت میں امریکہ کا کافی ہاتھ تھا، لیکن فتح کا سہرا اسی کے سر بندھا۔ امریکہ کی صلاحیتوں کا ابھی پوری طرح اندازہ نہیں ہوا تھا، اور اس کی دلچسپی بھی اپنے آپ تک محدود تھی۔ روس بھی برطانیہ کا حریف نہیں رہ سکا تھا کیونکہ وہ ایسے انقلاب کی لپیٹ میں آ گیا جس کے مضمرات کے متعلق پیش گوئی ناممکن تھی۔ روسی انقلاب کا امتحان دوسری جنگِ عظیم

---

[1] حاشیہ صفحۂ گزشتہ:۔ چند سال پہلے مجھے لندن میں دریائے ٹیمز کے کنارے کھڑے ہونے کا موقع ملا تو بڑی مشکل سے یقین کیا کہ یہ دریا ہے۔ ایک پُر ہنگم شہر کے گندے نالے کو آسمان سے اترا ہوا تاریخ و رومان بدوش دریا کہنا اور کہلوانا برطانوی استعمار ہی کی کرشمہ سازی ہو سکتی ہے۔

میں جاکر ہوا اور پھر جا کے پتہ چلا کہ وہ دوبارہ صفِ اول کی طاقت بن نہیں گیا تو بننے کے قابل ضرور ہوگیا ہے۔ دونوں جنگوں کے درمیانی عرصے میں بھی برطانیہ کی سیادت قائم رہی اور بے دریغ استحصال اور غارت سے اس نے اپنے آپ کو خوب مالامال کیا۔ اس طرح اس نے ایک معمولی اور بے مایہ جزیرے کو دنیا کا مالی، سیاسی، تجارتی، ثقافتی اور اعصابی مرکز بنائے رکھا۔

برطانیہ کی قسمت کا فیصلہ دوسری جنگ نے کیا۔ اس کے لئے فرار کا کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا۔ پھر بھی اس تاریخی فیصلے کی بے پناہی کا اعتراف کرنے سے وہ پہلوتہی کرتا رہا۔ اس جنگ نے امریکہ کو ایک عالمی قوت کا درجہ دے دیا۔ اور ایٹم بم کی ملکیت نے اسے واحد اور برترین طاقت بنا دیا۔ روس نے اپنا سکّہ تو منوالیا تھا لیکن ایٹم بم کے بغیر وہ امریکہ کے مقابلے میں بے بس دکھائی دیتا تھا۔ اس میں البتہ کوئی شبہ نہیں رہ گیا تھا کہ امریکہ کے بعد روس کا درجہ ہے برطانیہ کا نہیں۔ برطانیہ اس سے ہراساں نہیں ہوا۔ امریکہ میں اسے اپنا ہمزاد نظر آیا۔ اور ضرورت سے مجبور ہوکر بھی اور موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے بھی اس نے امریکہ کا یوں سہارا لینا شروع کر دیا کہ کمان امریکہ کی ہو اور تیر برطانیہ کا چلے برطانیہ جیسے شاطر کی امریکہ کو بھی ضرورت تھی۔ اس کی جگہ لینے کے لئے بھی ضروری تھا کہ برطانیہ امریکہ کا ساتھ دے۔ اشتراکِ اغراض و مصالح نے دونوں میں قدرتی طور پر ملی بھگت پیدا کر بھی دی اور کئے بھی رکھی۔ لیکن برطانیہ کی کوششوں کے علی الرغم مرکزِ ثقل بتدریج امریکہ کی طرف بدلتا گیا۔ یہ ناگزیر تھا۔ برطانیہ کی عالمی حیثیت ذاتی نہیں تھی، سراسر مستعار تھی۔ یہ دین تھی اس کی سلطنت کی۔ جب دوسری جنگِ عظیم کے بعد برطانیہ کے مقبوضات اور محروسات آزاد ہونے شروع ہوتے تو سلطنت کے انتشار کے ساتھ ساتھ اس کی عالمی حیثیت بھی متزلزل ہونے لگی۔ اس پر اس نے امریکہ کی بغل کو اور مضبوطی سے تھام لیا۔ چنانچہ چرچل جیسا شخص اس روایتی خچر کی سطح تک آجانے پر مجبور ہوگیا جس سے اب وجد کے بارے میں سوال کیا گیا تو اس نے، اقبال کے الفاظ میں، جواب دیا تھا:

میرے ماموں کو نہیں پہچانتے شاید حضور
وہ صبا رفتار شاہی اصطبل کی آبرو

ہیروشیما پر ایٹم بم گرائے جانے کے فوراً بعد ۹ اگست ۱۹۴۵ء کو چرچل نے ایک بیان میں کہا:

نئی قوت ایک ہیبت ناک ذمہ داری کے طور پر ہماری تحویل میں آئی ہے۔
خدا کا شکر ہے کہ یہ طاقت (ذمہ داری) ہمارے حصے میں آئی۔

امریکی ایٹم بم کو اپنی قوت کہنا مادیانِ برطانیہ ہی کا کام ہوسکتا تھا۔ سٹالن کے الفاظ میں اس کا مطلب یہ تھا۔

چرچل اور ان کے برطانوی اور امریکی دوست دراصل ہمیں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ
ہمارا حکم بلا چون وچرا مانو تو ٹھیک ہے ورنہ جنگ کا خمیازہ بھگتو۔

سٹالن نے یہ نتیجہ یونہی نہیں نکال لیا تھا۔ امریکی صدر ٹرومین نے صاف طور پر کہہ دیا تھا:

> تمام دنیا کو امریکی نظام قبول کر لینا چاہیئے . . . امریکی نظام کے زندہ رہنے کی صورت بھی یہی ہے کہ وہ عالمی نظام بن جائے۔

برطانیہ نے تجارت کے بہانے سلطنت قائم کر لی تھی اور سلطنت کے زور پر تجارت کرتا چلا آرہا تھا۔ اس کی سلطنت ختم ہونے لگی تو معاشی اقتدار تا دیر برقرار نہیں رہ سکتا تھا۔ دونوں کو باقی رکھنے کے لئے اس نے سیاست اور تجارت کو ایک حد تک علیحدہ علیحدہ کر دیا۔ سنگاپور سے جبرالٹر تک اس نے اپنے دورِ اقتدار میں جو جنگی اڈے قائم کر رکھے تھے، ان میں سے متعدد اہم اڈے اس نے حیلوں بہانوں سے برقرار رکھے لیکن ساتھ ساتھ یہ کوشش کرتا رہا کہ وہ اڈے رہیں تو اس کے تصرف میں، لیکن ان کا مالی بوجھ زیادہ سے زیادہ امریکہ سنبھالے۔ امریکہ کے لئے یہ سودا مہنگا یا ناگوار نہیں تھا۔ کیونکہ اس کی نظرِ استعمار دنیا بھر پر پڑ رہی تھی۔ اور اس کے عزائم کی تکمیل کے لئے برطانیہ سے بہتر معاون میسر نہیں آسکتا تھا۔ امریکہ یہ قیمت دینے پر تیار ہو گیا۔ سیاسی طور پر یوں مطمئن ہو کر برطانیہ نے سابقہ مقبوضات میں معاشی اثر و نفوذ پھیلانا شروع کیا اور ان کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے بہانے ان سے تجارتی فوائد حاصل کرنے لگا۔ یہ چال بہت حد تک کامیاب رہی اور گو امریکہ اور برطانیہ میں اندر اندر بدمزگی پیدا ہو جاتی رہی عمومی اعتبار سے اور دیکھنے میں وہ ایک دوسرے کے معاون اور حلیف بنے رہے۔ ان کی دوستی ذاتی اغراض و مصالح کی جس شاخِ نازک پر قائم تھی وہ جلدی ہی جواب دینے لگی۔ امریکہ کے استعماری تقاضے مرورِ وقت سے تیزی کے ساتھ بڑھنے لگے تو برطانیہ کے لئے امریکہ کا ہم قدم رہنا مشکل سے مشکل تر ہو گیا۔ پھر تجارت کی خاطر برطانیہ کو بعض جگہ امریکہ کی عملی مخالفت کرنی پڑ گئی۔ مثلاً امریکہ چین کو صفِ اول کا دشمن سمجھتا ہے لیکن برطانیہ نے چین کو تسلیم کر رکھا ہے اور وہ اس سے سیاسی اور تجارتی روابط قائم رکھنے اور بڑھانے پر مجبور ہے۔ اسی طرح ایٹم بم تنہا امریکہ کے پاس تھا تو برطانیہ اسے اپنی قوت سمجھتا تھا۔ لیکن روس ایٹم بم بنا لینے میں کامیاب ہو گیا تو برطانیہ نے بھی اس قوت کا مالک بن جانا ضروری سمجھا تاکہ طفیلی بن جانے کے باوجود وہ اپنی انفرادیت برقرار رکھ سکے۔

یوں امریکہ اور برطانیہ کے راستے متوازن بھی ہونے لگے اور برطانیہ اس دوڑ میں پیچھے بھی رہنے لگا۔ سابقہ سلطنت کو اس نے دولتِ مشترکہ بنایا اور اس بھان متی کے کنبے سے اپنی سابقہ سیادت برقرار رکھنا چاہی۔ سلطنت کے بغیر یہ بوسیدہ دیوار قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ سیاسی زوال کے بعد معاشی استحصال کے مواقع بھی تدریجی طور پر کم ہو گئے۔ برطانیہ نے بہت آنکھیں بند کیں اور دولتِ مشترکہ، عالمی تجارت اور امریکی استعمار کو اپنی گزشتہ سیادت کا بدل سمجھنے لگا۔ اپنے آپ اور دوسروں کو وہ ایک عرصہ یہ دھوکا دیتا رہا کہ وہ پہلے کی طرح صفِ اول کی عالمی طاقت ہے۔ لیکن سیاسی طور پر وہ امریکہ سے مات کھاتا گیا تو معاشی اعتبار سے ان قوموں سے پٹنے لگا جو پہلے اس کی حلقہ بگوش

تھیں۔ غلامی میں برطانیہ ان کی دولت کا بلا شرکتِ غیرے مالک ہوا کرتا تھا مگر آزادی کے بعد انہوں نے اپنی دولت خود پیدا کرنے اور اپنے ہی مصرف میں لانے کی طرح ڈالی۔ اس کا اثر برطانیہ پر پڑتا رہا، پڑتا رہا تا آنکہ وہ یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو گیا کہ سیاست اور دولت اس کی کنیزِ خانہ نہیں رہیں۔ دولتِ مشترکہ کی کشتی سے ایک قدم نکال کر اس نے یورپ کی مشترکہ منڈی کی کشتی میں رکھنا چاہا، اس خیال سے کہ دو کشتیوں کی سواری میں اسے دونوں طرف کے فوائد حاصل ہوں گے لیکن یورپ کی طرف سے اسے صاف جواب مل گیا کہ دولتِ مشترکہ میں رہنا ہے تو یورپ کا رخ نہ کرو اور یورپ کی طرف دیکھنا ہے تو دولتِ مشترکہ کا خیال چھوڑ دو۔ برطانیہ کے لئے یہی صلاح کار کی راہ تھی۔ وہ عالمی قوت نہیں رہا تھا اس لئے اسے یہ تسلیم کر لینا چاہیئے تھا کہ سلطنت کے بغیر وہ صرف ایک ملک ہے اور اسے اپنے ملکی وسائل پیش نظر رکھ کے انہیں کے مطابق مستقبل کے پیمانے ڈھالنے ہونگے۔ اس اعتراف کے بعد اسے اپنی قسمت یورپ سے وابستہ کر لینی چاہیئے تھی لیکن عالمی سیادت کا خناس سلطنت ختم ہو جانے کے بعد بھی اس کے سر میں پہلے کی طرح سمایا اور وہ اس بین حقیقت کا انکار کرنے پر مصر رہا کہ وہ یوسف بے کارواں ہو گیا ہے بلکہ وہ یوسف بھی نہیں رہا کیونکہ اسے جس کارواں نے یوسف بنایا تھا، وہی کارواں ختم ہو گیا تھا۔

برطانیہ کی ضد کے باوجود 'نئے زمانے نے تن تنہا استعمار کی گرمی جھاڑ کے رکھ دی۔ امریکہ کے سہارے کے باوجود برطانیہ کی کرمت ٹوٹنے لگی اور وہ ایسے مالی بحران سے دوچار ہو گیا کہ یہ اعلان کرنے پر آ گیا کہ نہر سویز سے سنگاپور تک جتنے اس کے بری، فضائی یا بحری اڈے ہیں، ان سے ۱۹۷۱ء تک بالکل دستبردار ہو جائے گا۔ یہ واضح اعتراف ہے برطانیہ کا کہ حالات نے اسے ایک ملک کی حیثیت پر قناعت کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس اعلان سے استعمار کی رسی تو جل گئی ہے لیکن اس کا بل نہیں گیا۔ چنانچہ یہاں سے ایک نئی عالمی مصیبت شروع ہو گئی ہے۔ یورپ کے استعمار کو اقوامِ یورپ نے اس قدر ناگزیر تصور کیا کہ جب اس لہر کا جذر شروع ہوا تو وہ یہ سوچ سوچ کے ہلکان ہونے لگیں کہ ان کے جانے سے جو خلاء پیدا ہوگا وہ پُر کیسے ہوگا۔ خلاء کا تصور خالصتہً استعماری ذہن کی پیداوار ہے ورنہ اس کی کوئی بنیاد نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ استعمار رخصت ہو جاتے، 'تو کہیں مل کے خس کم جہاں پاک سا رہے۔' برطانیہ نے فلسطین میں یہ خلاء پہلے یورپی صیہونیوں کو لا کر پُر کیا، پھر بحیرہ روم میں امریکہ کے داخلے کا راستہ ہموار کرکے رہی سہی کسر نکالی۔ نام نہاد خلاء کے یوں پُر ہونے سے عالمِ عرب' روس اور امریکہ کے مقابلے کا شکار ہو گیا۔ جب تک خلاء کا یہ تصور اور اس کے پُر کرنے کا یہ انداز رہے گا، عالمِ عرب نت نئے فتنوں کی آماجگاہ بنا رہے گا۔ خلاء کا یہی تصور ویت نام کی موجودہ قیامت کا موجب بنا۔ فرانس اس علاقے سے دستبردار نہیں ہونا چاہتا تھا لیکن جب وطن پرستوں نے اسے شکست دے کر نکال دیا، تو امریکہ اس مزعومہ خلاء کو پُر کرنے کے لئے آدھمکا جو فرانس کے اخراج سے واقع ہوا تھا۔ اب برطانیہ نے بامر مجبوری جنگی اڈے ختم کرنے کا اعلان کیا ہے تو ہونا یہ چاہیئے کہ وہ اپنے کام سے کام رکھے اور حدود برطانیہ میں رہ کر اپنے معاملات

کی دیکھ بھال کرے اور دوسروں کو اپنے طور پر اپنے معاملات کا انتظام و انصرام کرنے دے۔ ایسا ہو جاتے، اور ایسا ہونا بھی چاہیئے، تو یہ دنیا، جسے استعمارِ فرنگ نے ایسا جنگل بنا رکھا ہے جس میں ہر درندہ دوسرے کو پھاڑ کھانے کی فکر میں رہتا ہے، انسانوں کی ایسی بستی بن جائے جس میں انسان، انسان کا شکاری نہ ہو بلکہ ایک دوسرے کا غمگسار اور معاون بن جائے۔ لیکن ذہنِ استعمار یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ کاروبارِ جہاں اس کے بغیر چل سکے گا۔ چنانچہ وہ سمجھتا ہے کہ جہاں وہ نہیں ہوگا وہاں خلاء ہوگا۔ برطانیہ اب اسی ادھیڑبن میں ہے کہ جن علاقوں سے وہ نکلنے پر مجبور ہے وہاں سے نکلنے کے بعد بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود رہے۔ تاکہ اس کی ہوسِ استعمار کی تسکین ہوتی رہے اور وہ دوسری اقوام کے معاملات میں دخیل بھی رہے اور حکم بھی بنا رہے۔ صاف ظاہر ہے کہ استعمار ظاہری پسپائی پر مجبور ہوا ہے، اس کی ذہنی صفائی ابھی نہیں ہوئی۔ استعمار کے خلاف جنگ کا یہ دوسرا مرحلہ ہوگا جسے بہرحال انجام تک پہنچانا ہوگا۔

ایک لحاظ سے برطانیہ کو کسی قسم کی فکر نہیں ہونی چاہیئے۔ استعمار کے مظہرِ مجسم امریکہ نے کرۂ ارض کی بری، بحری، فضائی اور خلائی ناکہ بندی کر رکھی ہے۔ وہ بحرالکاہل پر پوری طرح چھایا ہوا ہے۔ جاپانی سمندر میں بھی وہ موجود ہے اور جنوبی چینی سمندر پر بھی اس کا بیڑہ مسلط ہے۔ نام نہاد بحرِ ہند میں اس کا بیڑہ کئی سالوں سے گشت کر رہا ہے۔ بحیرہ روم میں وہ کب سے دندناتا پھر رہا ہے۔ بحرِ اوقیانوس اس کی عسکری تنظیم کا مرکز ہے۔ اسی طرح امریکہ نے جاپان میں قدم جمائے ہوئے ہیں اور کوریا کے پھٹے میں ٹانگ اڑا رکھی ہے۔ وہ فارموسا ہتھیا کے بیٹھا ہے اور ویٹ نام کو مقبوضہ بنائے ہوئے ہے۔ تھائی لینڈ میں اس کے اڈے ہیں۔ بھارت اس کا طفیلی ہے۔ مغربی یورپ اس کا پروردہ ہے اور کئی ملکوں میں اس کی فوجیں متعین ہیں۔ خلا میں جو کچھ وہ کر رہا ہے، اس کا جائزہ فروری میں لیا جا چکا ہے۔ اس سے برطانیہ کو اطمینان ہونا چاہیئے کہ اس کے وضع ہو جانے سے جو مزعومہ خلاء پیدا ہوگا وہ امریکہ نے بھرپور طور پر پورا کر رکھا ہے۔ لیکن نہیں، استعمار کے سوچنے کے ڈھنگ نرالے ہوتے ہیں۔ برطانیہ ہر جگہ اپنی کٹھ پتلیاں چھوڑ کے جانا چاہتا ہے تاکہ اس کا نام لیا جاتا رہے اور اس کا کام چلتا رہے۔ رام وہ رہے اور لچھمن مقامی طور پر مل جائیں۔

خلاء کا تصور کم فتنہ انگیز نہیں تھا لیکن اسے پُر کرنے کا جو انداز ہے وہ کہیں زیادہ فتنہ انگیز ہے۔ برطانیہ کو "خلاء" پُر کرنے کے لئے ایک ہی ملک میسر آسکا ہے اور وہ ہے بھارت۔ یوں تو بھارت کو ایک عرصے سے استعمارِ فرنگ کے آلۂ کار کے طور پر تیار کیا جاتا رہا تھا لیکن اب اس پر نوازشات کی بارش کہیں زیادہ اور تیز تر کر دی گئی ہے۔ بھارت تو بھی چاہتا تھا کہ وہ ایشیا کیا دنیا بھر میں برہمن بن کر سنگھاسن پر براجمان رہے اور ہمسایہ قومیں اس کے چرنوں میں نس نوائیں اور بڑی قومیں کشتری بن کر اس کے سر پر چھتر تانے رہیں۔ اپنی آزادی کا سودا کرنے پر وہ آمادہ ہی نہیں، کب کا کر بھی چکا ہے۔ یہ سودا کر کے ہی وہ چین کے خلاف چڑھ دوڑا تھا، اور پھر اسی سودے کا امتحان لینے اور اسے مزید پکا کرنے کے لئے وہ پاکستان پر چل پڑا تھا۔ دونوں جگہ منہ کی کھا کر وہ اس سودے کو اور وسیع اور پکا کرنے میں لگا ہوا ہے۔ ایسا

بیوپاری امریکہ اور برطانیہ کو کہاں مل سکتا ہے۔ دونوں کو دکھائی دے رہا ہے کہ آج کل میں انہیں جنوب مشرقی ایشیا سے بے دخل ہونا پڑے گا۔ اس بے دخلی کے بعد بھارت دونوں کے لئے منہ مانگا اڈہ بن سکتا ہے۔ یہ ملی بھگت دونوں کے عزائمِ استعمار کی تکمیل کی مشترکہ صورت ہے۔ ایک ہی تیر میں دونوں کا شکار ہو سکتا ہے۔ استعمار کے یہ اندازے بھارت کو دیکھتے ہوئے غلط نہیں لیکن دونوں کا مقابلہ ان بے پناہ عوامی قوتوں سے ہے جو استعمار کے استیصال پر کبھی اتنی متحد اور مستعد نہیں ہوتی تھیں جتنی اب ہیں۔ چین، کوریا، ویت نام اسی اٹھتی چڑھتی موج کے ابھار ہیں۔ استعمار کے تخمِ خبیث کو نہ چین نے قبول کیا، نہ کوریا نے۔ ویت نام تو اسے اگل پھینک رہا ہے، اور کوئی دن جاتا ہے کہ اس کی مٹی یوں پاک صاف ہو جائے گی کہ کوئی اس بیج کو بونے کی سوچ بھی نہیں سکے گا۔

ویٹ نام کی جنگ کم فیصلہ کن نہیں لیکن استعمار کا آخری فیصلہ شاید بھارت میں ہو۔ وہاں استعمار ایسے برگد کی شکل اختیار کر چکا ہے جس کی زمینی جڑیں برطانیہ سے ہو کر امریکہ پہنچتی ہیں اور شاخوں سے بھارتی استعمار کی جڑیں لٹک لٹک کر ان سے ہم آغوش ہو کر غذائیت حاصل کرتی ہیں۔ برطانیہ اب اور زیادہ بھارت پر توجہ دینے لگا ہے اور اسے اپنا جانشین بنانے لگا ہے۔ استعمار پھر یہ بھول رہا ہے کہ حرفِ آخر اس کے ہاتھ میں نہیں۔ مشیت اس کے عزائم سے دغافل ہوتی نہ ہے۔ بھارت پر اس کی غیر معمولی نظرِ عنایت دیکھ کر روس اور کھل کر سامنے آگیا ہے۔ بھارت انقلاب سے پہلے کا چین بن گیا ہے۔ روس اور امریکہ اس محاذ پر روبرو ہیں اور حالات کی رو تیز تر ہو گئی ہے۔ اس کے مضمرات پاکستان کے لئے کیا ہیں، یہ علیحدہ مبحث ہے۔ البتہ دکھائی دے رہا ہے کہ مشیت تیزی سے مصروفِ کار ہے اور استعمار کا آخری فیصلہ کرنے میں لگ گئی ہے۔ اس کا قلم یہ فیصلہ چین اور پاکستان کے ہاتھوں لکھے گا۔

اِنسان نے کیا سوچا؟

کیا تنہا عقلِ انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت کر سکی تھی؟ اس اہم اور پیچیدہ سوال کا جواب یونان کے فلاسفروں سے لے کر ہمارے زمانے کے مفکرین اور سائنسدانوں نے

کیا دیا؟

یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں سے مستغنی کر دیگی۔ بڑی تقطیع۔ خوبصورت ٹائپ

عمدہ سفید کاغذ۔ مجلّد۔ قیمت بارہ روپے۔ ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۔ ۲۵/بی گلبرگ لاہور

حقائق و عبر

ا۔ سو میں سے آٹھ سو گئے، باقی کتنے بچے؟

روزنامہ امروز (لاہور) کی ۱۲/اکتوبر ۱۹۶۷ء کی اشاعت اسلام ایڈیشن میں حضرت بابا نولکھ ہزاری کے سوانح حیات پر مشتمل ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ:

آپ کا نام مراد شاہ تھا لیکن آپ نولکھ ہزاری کے لقب سے مشہور ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کو یہ لقب حضرت مٹھن شاہ نے عطا کیا تھا کیونکہ آپ نے نو لاکھ اور ایک ہزار مرتبہ قرآن پاک ختم کیا۔

اور یہ بھی لکھا ہے کہ "آپ نے سو سال سے زیادہ عمر پائی"۔

قرآن پاک کی اگر خاصی تیز رفتاری سے بھی تلاوت کی جائے تو اسے ختم کرنے میں کم از کم آٹھ نو گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ آٹھ گھنٹے کے حساب سے اگر کوئی شخص چوبیس گھنٹے تلاوت میں مصروف رہے اور نہ نماز کے لئے اٹھے، نہ ضروریات کے لئے، تو بھی نو لاکھ ایک ہزار مرتبہ قرآن پاک ختم کرنے کے لئے قریب سوا آٹھ سو سال کا عرصہ درکار ہوگا۔ اور حضرت بابا صاحبؒ کی عمر شریف قریب سو سال کی بتائی گئی ہے۔ اب آپ خود ہی سوچ لیجئے کہ یہ حساب کیسے درست بیٹھا؟

لگے ہاتھوں آپ ان کی ایک کرامت کا حال بھی سنتے جایئے۔ لکھا ہے۔

"قرآن پاک سے آپ کو عشق تھا اور ہر وقت اس کی تلاوت میں مشغول رہتے تھے۔ ایک دن بغیر وضو کے آپ کا ہاتھ قرآن مجید سے چھو گیا۔ آپ کو بہت رنج ہوا اور اپنے دل میں تہیہ کر لیا کہ کفارہ ادا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہاتھ ہی جسم سے الگ کر دیا جائے۔ آپ اس سوچ بچار اور غم میں اٹھ کر بازار چل دیئے۔ وہاں آپ نے بہت سے لوگوں کا شور سنا جو کہ ایک شخص کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ بھاگنے والا شخص جب آپ کے قریب پہنچا تو آپ نے اسے کھڑا کر لیا۔ اور ماجرا پوچھا۔ اس شخص نے بتایا کہ میں نے ایک دوکان سے چوری کی ہے اور لوگوں کو پتہ چل گیا ہے اس لئے مجھے پکڑنے کے لئے میرے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ اس شخص نے آپ سے التجا کی کہ اسے ان لوگوں سے بچایا جائے۔ آپ نے چور سے

چھپائی ہوئی چیز کی ادا سے بھاگ کر چوری کا الزام اپنے سر لے لیا۔ مقدمہ قرن کے قاضی کے پاس پہنچا اور مقدمہ کی سماعت کے بعد قاضی نے ایک ہاتھ کاٹ دینے کا فیصلہ سنایا۔ چنانچہ آپ کا وہ ہاتھ کاٹ دیا گیا جو کہ بغیر وضو کے قرآن مجید کو چھو گیا تھا آپ ہاتھ کٹوا کر خوشی خوشی اپنی قیام گاہ پر تشریف لائے۔ مریدوں اور عقیدتمندوں کو اس بات کا بڑا دکھ تھا کہ آپ نے ناحق پرائی چوری اپنے سر لی۔ آپ گھر آئے۔ بہت سے عقیدتمند آپ کے ساتھ تھے۔ آپ نے شکرانے کی نماز ادا کرنے کے لئے وضو کرنے کے لئے پانی لانے کے لئے کہا۔ جب آپ نے وضو کے لئے جسم کے گرد لپیٹی ہوئی چادر سے اپنے بازو باہر نکالے تو عقیدتمند یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ آپ کے دونوں ہاتھ سلامت ہیں۔"

اس کے بعد ہمارے بزرگ شکوہ سنج ہوتے ہیں کہ قوم کا نوجوان طبقہ اسلام سے دور بھاگا جا رہا ہے۔

۲۔ حرام کار کو مت روکو

امیر جماعت اسلامی' مودودی صاحب' فوٹو اتروانے کو شرعاً ناجائز قرار دیتے ہیں۔ لیکن ان کے اپنے فوٹو آئے دن شائع ہوتے رہتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے ان کی اس تضاد روی کے خلاف اخبارات میں عجیب و غریب کوائف شائع ہوتے تھے۔ لیکن مودودی صاحب نے اپنی مدافعت میں جو دلیل پیش کی ہے وہ اس قابل ہے کہ اسکی عام اشاعت کی جائے تاکہ اس کا افادہ عام ہو۔ اسے ذرا غور سے سنیئے۔

"ایک آدمی نے سوال کیا کہ آپ اخباری نمائندوں کو کیوں منع نہیں کرتے کہ وہ آپ کا فوٹو نہ اتاریں؟"

مولانا نے فرمایا: "بار بار منع کر چکا ہوں۔ ایک شخص کو اچانک شوٹ کر لیا جائے اور کیمرہ بندوق کی طرح اپنا کام کر جائے تو اس میں مقتول کا کیا قصور ہے؟"

انہی صاحب نے کہا: "جس وقت وہ فوٹو لینے لگیں، آپ اسی وقت منع کر دیا کریں۔"

مولانا نے فرمایا کہ "جب ایک آدمی حرام کا ارتکاب کرنے لگتا ہے تو اسے اگر روکا جائے، اور وہ نہ رکے تو وہ شدید گنہگار ہو گا۔ مجھے چونکہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اس وقت نہیں رکیں گے اس لئے اس موقع پر منع نہیں کرتا۔ ویسے اس معاملہ میں اسلام کے احکام سے کون سا اخباری نمائندہ یا فوٹوگرافر بے خبر ہے؟"

(آئین لاہور۔ ۱۶ اپریل ۱۹۶۷ء)

کیوں ہے نا اس قابل کہ اس کی اشاعت عام کی جائے تاکہ اس سے بہتوں کا بھلا ہو؟ معلوم نہیں اگر کوئی جیب تراش

مولانا صاحب کی جیب میں ہاتھ ڈالنے لگے تو اس وقت آپ کا طرزِ عمل کیا ہوگا؟

(۰)

۳۔ اس کی وجہ منافقت ہے!

۲۵ر دسمبر ۱۹۶۷ء کو لاہور میں، قائد اعظمؒ کی یاد میں منعقد کردہ ایک جلسہ میں، میاں طفیل محمد صاحب (امیر جماعت، مغربی پاکستان) نے اپنی تقریر میں قائد اعظم کو اپنا خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اس پر بعض حلقوں کی طرف سے یہ اعتراض کیا گیا کہ تحریکِ پاکستان اور اسکے بعد تک تو جماعت اسلامی، اس تحریک کی مخالفت کرتی، اور قائد اعظمؒ کی شان میں ایسے ذلت آمیز الفاظ استعمال کرتی رہی جن کی جرأت ان کے کسی بدترین غیر مسلم دشمن کو بھی نہیں ہوئی تھی، تو اب اس جماعت پر کون سی آسمانی وحی نازل ہوئی ہے جس نے ان پر یہ حقیقت بے نقاب کردی ہے کہ قائد اعظمؒ ان کے خراجِ عقیدت کے مستحق ہیں۔ ان اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے میاں صاحب موصوف نے (اخبار ایشیا۔ کی ۱۱ر جنوری ۱۹۶۸ء کی اشاعت میں) ایک لمبا چوڑا بیان شائع کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ملک میں اور افراد اور جماعتیں بھی ہیں جنہوں نے تحریکِ پاکستان اور قائد اعظمؒ کی مخالفت کی تھی اور اب وہ ان کی مداح ہیں۔ ان کے خلاف اس قسم کے اعتراضات کیوں نہیں کئے جاتے؟

ہم میاں صاحب کی خدمت میں یہ عرض کریں گے کہ ان افراد اور جماعتوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ انہوں نے تحریکِ پاکستان یا قائد اعظمؒ کی مخالفت نہیں کی تھی۔ وہ یا تو خاموش ہیں اور یا اپنی اُس وقت کی غلطی کا اعتراف کرتی ہیں۔ لیکن جماعت ملک کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہی ہے کہ اس نے نہ تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی تھی، نہ قائد اعظمؒ کی شان میں کوئی گستاخانہ کلمہ کہا تھا؛ حالانکہ اس جماعت کا اُس زمانے کا لٹریچر ان کے اس دعویٰ کی خود تردید کرتا ہے۔ جماعت اسلامی کی یہ منافقانہ روش ہے جس کی بنا پر ان کے خلاف اعتراضات کئے جاتے ہیں۔ اگر یہ جماعت دیانتداری سے اس کا اعتراف کرلے کہ ان سے اُس زمانے میں غلطی ہوئی تھی جس کے لئے وہ نادم ہے اور بحضورِ ملّت معذرت خواہ، تو پھر ان کے خلاف اس قسم کا اعتراض نہیں کیا جاسکے گا۔ اس جماعت کا یہ دوغلا پن ہے جس کی وجہ سے یہ لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل ہو رہی ہے۔

میاں صاحب نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر جماعت اسلامی نے تحریکِ پاکستان میں مسلم لیگ کا عملاً ساتھ نہیں دیا، تو کیا ہوا؟ یہ اپنے طور پر قوم کی خدمت کرتی رہی۔ اس لئے قوم کو اس کا مرہونِ منت ہونا چاہیئے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ میاں صاحب کے اس سوال کا جواب، روزنامہ نوائے وقت، کی ۱۸ر جنوری ۱۹۶۸ء کی

کی اشاعت کے اداریہ میں ملتا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ اگر اپنے اپنے مخصوص انداز میں قوم کی خدمت کو معیار قرار دیا جائے تو:

> اس طرح تو یونینسٹ اور نیشنلسٹ مسلمانوں نے بھی اپنے مخصوص انداز میں برصغیر کے مسلمانوں کی خدمت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہوگا۔ کل کو یہ بھی کہا جانے لگے گا کہ خضر حیات خان یا مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے رفقاء بھی پاکستان کے لیڈر تھے۔ تو پھر یہ سلسلہ کہاں جا کر رکے گا۔

* * *

۴۔ یا مقلّب القلوب

پچھلے دنوں مریضوں کے دل بدل دینے کے اپریشنوں کا جو چرچا ہوا ہے تو اس نے دنیائے طب میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا ہے اور اس امر کے امکانات روشن نظر آنے لگ گئے ہیں کہ بہت سی جانیں جو انسان کی جہالت یا کم علمی کی وجہ سے ضائع ہو جاتی تھیں، اب بچالی جایا کریں گی۔ اب دنیا کے مختلف ممالک میں اس جدید انکشاف کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر ہو رہا ہے لیکن ہمارے ملّا نے (جسے اپنی نہیں، دوسروں کی نجات کی فکر طلسم پیچ و تاب بنائے رکھتی ہے) حسب معمول ایک نئی بحث چھیڑ دی ہے۔ اور وہ یہ کہ انسان کا دل تو اس کے ایمان کا مسکن ہوتا ہے۔ اگر کسی کافر کا دل، مسلمان کے سینے میں پیوست کر دیا گیا (یا مسلمان کا دل کافر کے سینے میں) تو حشر کے دن ان کی نجات و مغفرت کا فیصلہ کس طرح سے ہوگا؟ چنانچہ وہ یہ فتوے دینے کی سوچ رہے ہیں کہ اس قسم کی تبدیلیٔ قلوب کو خلافِ شریعت قرار دے دیا جائے۔ (غنیمت ہے کہ ملّا نے ابھی یہ نہیں سن پایا کہ ڈاکٹر، انسانوں کے سینے میں جانوروں کا دل پیوست کرنے کی بھی سوچ رہے ہیں) اس اندیشہ کے پیش نظر ہمیں جنوبی افریقہ سے ایک استفسار بھی موصول ہو گیا ہے۔

ہمارے مولوی صاحبان کو کون سمجھائے کہ جس قلب کو ایمان کا مسکن اور انسانی آرزوؤں اور تمناؤں کا نشیمن قرار دیا جاتا ہے، وہ گوشت پوست کا وہ ٹکڑا نہیں ہوتا جس کی دھڑکن ہمیں ہر وقت سنائی دیتی رہتی ہے۔ اور جس کی جگہ دوسرا قلب پیوست کیا جا سکتا ہے۔ وہ قلب درحقیقت نفسِ انسانی کا دوسرا نام ہے۔ اسی دشواری کے پیش نظر انگریزی زبان میں (HEART) اور (MIND) دو الگ الفاظ آتے ہیں لیکن ہمارے ہاں ان دونوں کا ترجمہ "دل" ہی کیا جاتا ہے۔ وہ دل جو گوشت کا ٹکڑا ہوتا ہے، بدلا جا سکتا ہے اور اس کے بدلنے سے انسانی خیالات و معتقدات پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ لیکن وہ دل جو کفر و ایمان کا مسکن ہوتا ہے، منفرد ہوتا

ہے اور کسی دوسرے کے ساتھ بدلا نہیں جا سکتا۔

اس سلسلہ میں ایک مولویانہ ذہنیت رکھنے والے بزرگوار سے ہماری دلچسپ گفتگو ہوئی تھی۔ ہم نے ان سے کہا کہ قبر میں مردے کا سارا جسم کیڑے کھا جاتے ہیں۔ اسی میں دل بھی ہوتا ہے۔ تو وہ کہنے لگے کہ نہیں! منکر نکیر دل کو نکال کر پہلے ہی لے جاتے ہیں۔ ہم نے کہا کہ میڈیکل کالج کے طلباء مُردوں کا دل نکال کر، الگ شیشے میں رکھ چھوڑتے ہیں، اسے تو فرشتے نہیں لے جاتے۔ تو وہ کچھ سوچ کر کہنے لگے کہ کسی کا دل کہیں بھی ہو، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے اس شخص کے سینے میں رکھ دینگے۔ ہم نے کہا کہ جس خدا کی قدرت کا ملہ ایسا کر سکتی ہے اس کے لئے یہ کیا دشوار ہوگا کہ عبد الرحمٰن کا اصلی دل 'ہرنام سنگھ کے سینے سے نکال کر عبد الرحمٰن کے سینے میں دوبارہ رکھ دے'! اس پر وہ لاحول پڑھ کر چل دیئے اور ہم نے، ان کے دل کے متعلق، بحضور مقلب القلوب دعا کی کہ

بدل دے اور دل اس دل کے بدلے

الٰہی! تُو تو رَبُّ العالمین ہے!

لیکن اس کی طرف سے اس کا جواب آیا کہ انسان اپنے دل کو آپ ہی بدل سکتا ہے۔ جو خود اپنا دل بدلنا نہ چاہے اس کے دل کو ہم بھی نہیں بدلا کرتے۔ فَلَمَّا زَاغُوْا اَزَاغَ اللّٰہُ قُلُوْبَهُمْ۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفَاسِقِیْنَ۔ (۶۱/۵)

۵۔ یہ مقام بلند

آج کل چین سے جو لٹریچر آ رہا ہے اس میں آپ ایک چیز اساسی اور بنیادی دیکھینگے اور وہ یہ کہ ارکانِ مملکت مصروفِ گفتگو ہوں یا عمائد افواج مشغول رزم و پیکار۔ کسان ہل چلا رہے ہوں یا مزدور سڑک کوٹ رہے ہو۔ دکاندار سودہ سلف بیچ رہے ہوں یا صنعت گر مصنوعات تیار کر رہے، طلبا سبق پڑھ رہے ہوں یا فلاسفر محوِ تفکر، عورتیں ہوں یا مرد، لڑکیاں ہوں یا لڑکے، ہر ایک کے پاس ہر جگہ، ایک سرخ کتاب ہوگی جس پر لکھا ہوگا ——— افکار ماؤزے تنگ ——— کوئی مسئلہ درپیش ہو وہ اس کتاب کو کھول کر بیٹھ جائینگے اور اس سے اپنے لئے راہنمائی تلاش کرنے کی کوشش کرینگے۔

بعینہٖ یہی مقام کبھی مسلمانوں کے ہاں، خدا کی کتابِ عظیم ——— قرآن مجید ——— کو حاصل تھا جس نے اس قوم کو تحت الثریٰ کی پستیوں سے اٹھا کر کہکشاں گیر بلندیوں تک پہنچا دیا تھا۔ تا آنکہ مجوسی سازش اپنا کام کر گئی اور اس قوم نے اس ضابطۂ راہنمائی کو چوم کر طاقوں میں رکھ دیا اور اس کے بعد ؎

حقیقت خرافات میں کھو گئی　　　یہ اُمت روایات میں کھو گئی

میں نے اِس درس سے کیا پایا

جشنِ تکمیلِ درسِ قرآن کی تقریب پر محترم ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب کا بصیرت افروز مقالہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَلَمْ يَكُن لَّهُ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا (۲۵/۲)

یہ کتاب اس خدا کی طرف سے آئی ہے جس کے حیطۂ اقتدار سے کوئی شے باہر نہیں۔ کائنات میں ہر جگہ اسی کا قانون کارفرما ہے۔ اسے نہ اپنی بقا کے لئے اولاد کی ضرورت ہے اور نہ ہی اس کے اقتدار میں کوئی اور قوت شریک ہے۔ اس نے ہر شے کو ایک خاص ترتیب دے کر پیدا کیا۔ اور پھر اس کے امکانات اور صلاحیتوں کے پیمانے مقرر کر دیئے۔

معزز خواتین و حضرات! میرا آج کا موضوع مقالات کے اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو آپ احباب نے گذشتہ اتوار جشن ختم قرآن العظیم کے موقع پر شروع کیا تھا۔ یعنی "محترم پرویز صاحب کے درسِ قرآن سے میں نے کیا پایا"۔ ۵ ؍ جولائی ۱۹۶۵ء کے روز یعنی نصف قرآن کریم ختم ہونے پر جو جشن منایا گیا تھا اس وقت بھی میں نے اسی موضوع پر ایک مقالہ پیش کیا تھا۔ اس میں میں نے اس درس سے اخذ کئے ہوئے جن چند بنیادی تصورات کا ذکر کیا تھا وہ یہ تھے ــــ (۱) خدا کا تصور، (۲) نجات، (۳) جزا اور سزا، (۴) حسنات و سیّئات، (۵) قانونِ مکافاتِ عمل، (۶) تقدیر، (۷) وحی، (۸) ربوبیت، (۹) دین، (۱۰) صلوٰۃ و زکوٰۃ، (۱۱) قرآن کا معاشی نظام۔ (۱۲) اسلام کا نظامِ حکومت۔

آج مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ ایک سوال ہمیشہ سے انسانوں کے ذہن میں چلا آرہا ہے اور آج بھی اسی طرح تازہ ہے جس طرح کہ آج سے صدیوں پہلے تھا۔ میرے ایک سائنسدان دوست بتلاتے ہیں کہ جب وہ

کیمبرج یونیورسٹی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لینے گئے تو وہاں ان کا ایک پروفیسر ہمیشہ یہی کہا کرتا تھا۔ کہ جب وحی کے بغیر دنیا کے سارے کام چل رہے ہیں تو پھر ہر بات کے لئے تم لوگ وحی کو کیوں بیچ میں لاتے ہو؟ سوال بڑا اہم ہے لیکن یہ ان لوگوں کے ذہن میں پیدا اس لئے ہوتا ہے کہ جب وحی کا نام آتا ہے تو ان کے سامنے وہی مروجہ مذہب کا تصور ہوتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر مذہب کو الگ کر دیا جائے، جیسا کہ یورپ والوں نے کیا ہوا ہے، تو اس سے دنیا کے کون سے کام رُک جاتے ہیں؟ اور اگر کسی شخص کی نظر قرآن اور اسکے دیئے ہوئے دین پر نہ ہو تو وہ اس سوال کا جواب دے بھی کیا سکتا ہے؟

برادران: بعض باتیں جو ہم مسلسل کئی برسوں سے محترم پرویز صاحب کے درس میں سُنتے چلے آتے ہیں، ہمارے کان ان سے اس قدر مانوس ہو چکے ہیں کہ یہ ہمیں معمولی سی معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن دراصل انکی اہمیت کیا ہے، آپ اس سوال سے اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ایک مولوی صاحب سے جو جمعہ کے روز سینکڑوں اور عید کے روز ہزاروں سے خطاب کرتے ہیں، میں نے اسی سوال کا ذکر کیا تو کہنے لگے کہ دیکھا! میں نہیں کہا کرتا ہوں کہ ان کافروں سے زیادہ میل ملاقات رکھنا گناہ ہے۔ یہ کسطرح مسلمانوں کے عقاید خراب کرتے ہیں؟ گویا مولوی صاحب کے نزدیک اگر کوئی عقل کی بات پوچھے تو اس سے فرار کی راہ اختیار کرنی چاہیئے۔

ہمیں وحی کیا دیتی ہے؟

برادران! اب میں محترم پرویز صاحب کے الفاظ میں بیان کروں گا کہ وحی وہ کیا چیز دیتی ہے جو عقل کے پاس نہیں اور کس طریق سے انسانی مسائل کے حل کرنے میں مدد دیتی ہے اور کیوں کہ وحی کی روشنی میں انسانی ارتقاء کی منزلیں ہزاروں سال کی بجائے دنوں میں طے ہوتی ہیں۔

انسانی عقل ہر اس کام پر آمادہ ہوتی ہے جس میں اس کا اپنا فائدہ ہو۔ دو چیزوں کی قیمت میں فرق ہو تو عقل زیادہ قیمت کی چیز کو قبول کرے گی۔ عقل اپنے مشاہدہ اور تجربہ کی بنا پر ان چیزوں کی قیمتیں مقرر کرتی ہے۔ اس کے بعد ایک تیسری چیز کی قیمت ان دونوں چیزوں سے زیادہ ہو تو وہ پہلی دو کو چھوڑ کر اس تیسری چیز کو قبول کرے گی۔ چنانچہ عقل کی رو سے مقرر کردہ قیمتیں اضافی ہوتی ہیں۔ وحی ایسی چیزوں کی طرف اشارہ کرتی ہے جن کی قیمت مستقل اور مطلق ہوتی ہے۔ چنانچہ وحی عقل کی تربیت کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ فلاں چیز اختیار کرنے سے اس کا مستقل فائدہ ہے۔ یہ چیزیں، جن کی قیمت اضافی نہیں بلکہ مستقل اور مطلق ہوتی ہے، انہیں مستقل اقدار کہتے ہیں۔ انسان دو چیزوں سے عبارت ہے۔ اس کا مادی جسم اور اس کی ذات۔ جسم مسلسل تحلیل ہوتا رہتا ہے اور بالآخر فنا ہو جاتا ہے۔ ذات کی اگر نشوونما ہو جائے، تو ہمیشہ باقی رہنے والی چیز ہے۔ اس لئے انسان کا فائدہ اس میں ہے کہ اگر دو ایسی چیزوں میں ٹکراؤ پیدا ہو جائے جن میں ایک جسم کے لئے مفید

ہے اور ایک ذات کے لئے ، تو ایسی چیز کو اختیار کرے جو ذات کے لئے فائدہ مند ہو۔ از روئے قرآن انسان کی طبعی زندگی اور اس کے ساز و سامان بھی اپنی اقدار رکھتے ہیں جن کا تحفظ ضروری ہے۔ لیکن یہ اقدار مستقل نہیں اضافی ہیں۔ اب دیکھئے قرآن کون کونسی چیزیں بیان کرتا ہے جن کی قیمت مستقل اور مطلق ہے اور جو انسانیت کی نشو و ارتقاء کا باعث ہوتی ہیں۔

مستقل اقدار

(۱) انسانی ذات :۔ یہ خود بلند ترین مستقل قدر ہے اور باقی اقدار اسکی نشوونما کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اور جب اس میں پختگی آجائے تو یہی اقدار سورج کی کرنوں کی طرح اس سے خود بخود پھوٹتی اور ابھرتی چلی جاتی ہیں۔

(۲) احترامِ آدمیت :۔ یہ بھی ایک مستقل قدر ہے۔ چونکہ انسانی ذات ہر انسانی بچے کو یکساں طور پر ملتی ہے اس لئے ہر انسان محض انسان ہونے کی وجہ سے واجب الاحترام قرار پا جاتا ہے۔ چنانچہ از روئے قرآن تمام انسانوں کو واجب التکریم بنایا گیا ہے۔ اس سے ذات پات، حسب نسب اور رنگ و نسل کے تمام امتیازات ختم ہو جاتے ہیں۔

(۳) مدارج بہ اعتبارِ عمل :۔ پیدائش کے طور پر ہر انسان برابر کا واجب الاحترام ہے۔ لیکن اس کے بعد احترام کے مدارج انسانوں کے اعمال کے مطابق متعین ہوتے ہیں۔ جو سب سے زیادہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتا ہے وہ سب سے زیادہ واجب التکریم ہوگا۔ یعنی عزت و تکریم کے معیار انسان کے ذاتی جوہر ہیں، نہ کہ انسانی نسبتیں۔

(۴) عدل :۔ تمام انسانوں کو پیدائش کے اعتبار سے یکساں سمجھنا۔ ہر ایک کے لئے اس کی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے یکساں مواقع مہیا کرنا اور سعی و عمل کے لحاظ سے ان کے مقامات و مدارج متعین کرنا۔ محنت کے مطابق معاوضہ دینا۔ کسی کے حقوق و واجبات کو سلب نہ کرنا۔ اور تمام امور کے فیصلے اس قانون کے مطابق کرنا جو سب پر یکساں طور پر نافذ ہو، عدل کہلاتا ہے۔ یہ ایک مستقل قدر ہے جو انسانی معاشرے کا بہت بڑا ستون ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل نہ کرو۔

(۵) جرم کی پاداش :۔ قانون کی دانستہ خلاف ورزی جرم کہلاتی ہے۔ چونکہ اس سے نظامِ عدل ٹوٹ جاتا ہے اس لئے اس ذہنیت اور اس قسم کے اقدام کی روک تھام ضروری ہے۔ اس روک تھام کو جرم کی سزا یا قصاص کہتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اے صاحبانِ عقل و بصیرت! تمہارے لئے قصاص میں زندگی کا راز پوشیدہ ہے تاکہ تم قانون کی اچھی طرح نگہداشت کرسکو۔ قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ جرم کی سزا باندازۂ جرم ہونی چاہیئے۔ اگر مجرم اپنے کئے پر نادم ہو اور اس میں اصلاح کا امکان نظر آئے تو اسے معاف کر دینا چاہیئے۔ اور یہ بھی کہ جرم کی سزا صرف مجرم کو ملنی چاہیئے۔ یہ نہیں کہ جرم کوئی اور کرے اور سزا کسی اور کو دی جائے۔

(۶) از روئے قرآن کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ عدل کا تقاضا ہے کہ ہر شخص اپنی ذمہ داری خود اٹھائے۔ اس اصول کا اطلاق زندگی کے ہر شعبے میں ہو سکتا ہے۔

(۷) نا روا ظلم :- قرآن نے صرف اتنا ہی نہیں کہا کہ تمہیں ظلم نہیں کرنا چاہیئے بلکہ یہ بھی کہ کسی کو جرأت نہیں ہونی چاہیئے کہ تم پر یا کسی اور پر ظلم کر سکے۔ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ۔ ایک مستقل قدر ہے۔ بالفاظ دیگر اپنے اندر اتنی قوت پیدا کرنا کہ کسی ظلم کو دست درازی کی جرأت نہ ہو سکے۔ نہ صرف تمہارے خلاف بلکہ کسی کمزور و ناتواں کے خلاف بھی۔ ظالم کے ظلم کو روکنے کے لئے اگر جنگ کے سوا کوئی اور چارہ کار نہ رہے تو قرآن اس کی بھی اجازت دیتا ہے۔

(۸) احسان :- جہاں توازن بگڑ جائے اس توازن کو درست کرنا احسان ہے۔ ایک شخص پوری محنت کے بعد بھی اتنا نہیں کما سکتا جتنا کہ اس کے اور اس کے بچوں کے گزارہ کے لئے کافی ہو تو معاشرہ کے لئے ضروری ہے کہ اس کی کمی کو پورا کرے۔ عدل بدلے اور معاوضے کا متقاضی ہوتا ہے۔ یعنی اس میں دوسروں کے واجبات ادا کئے جاتے ہیں۔ لیکن احسان میں بدلے اور معاوضے کا سوال نہیں ہوتا۔

(۹) کوئی کسی کا غلام اور محکوم نہیں ہو سکتا :- از روئے قرآن کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ خدا اُسے ضابطہ قوانین، قوت اور نبوت عطا کرے اور وہ دوسرے لوگوں سے کہے کہ تم خدا سے ورے میرے محکوم اور غلام بن جاؤ۔ چنانچہ ہر فرد کی آزادی اور اس آزادی کا احترام مستقل قدر ہے۔ حکومیت صرف اللہ کے قوانین کی ہے، انسان کے خود ساختہ ضوابط کی نہیں۔ اللہ کے قوانین کا اطلاق ہر فرد و معاشرہ پر یکساں طور پر ہوتا ہے۔

(۱۰) قانونِ مکافاتِ عمل :- اچھا کام وہ ہے جو قانونِ خداوندی کے مطابق ہو۔ بُرا کام وہ ہے جو قانونِ خداوندی کے خلاف ہو۔ ہر اچھے یا بُرے کام کا ایک نتیجہ ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ کائنات کی یہ عظیم القدر اور حیرت انگیز مشینری اس مقصد کے لئے سرگرم عمل ہے کہ ہر عمل اپنا صحیح نتیجہ مرتب کرتا رہے۔ اسی کا نام قانونِ مکافاتِ عمل ہے۔ اس کے مطابق نہ کسی کے اجر میں کمی کی جاتی ہے اور نہ کسی کو بلا سعی و عمل کچھ بخش دیا جاتا ہے۔

(۱۱) انسانی نظامِ عدل :- انسانوں کے وضع کردہ عدالتی نظام کے لئے بھی قرآن نے مستقل اقدار دی ہیں۔ (ا) حق کو جان بوجھ کر نہ چھپایا کرو۔ (ب) شہادت کو کبھی نہ چھپایا جائے۔ (ج) حق اور باطل میں کبھی (CONFUSION) نہ پیدا کیا جائے۔ (د) کسی قسم کے لالچ یا ذاتی منفعت یا کسی رعایت یا عداوت کے خیال کے بغیر محض حق کی خاطر شہادت دی جائے۔ (س) جو لوگ اپنی ذات یا اپنے لوگوں کے خلاف بددیانتی

برتیں، ان کی وکالت مت کرو۔

(۱۲) امر بالمعروف و نہی عن المنکر :۔ قرآنی معاشرے کا فریضہ ہے کہ ہر ایک کو قانونِ خداوندی کے مطابق چلنے کا حکم دے اور قانون کی خلاف ورزی سے روکے۔ قانونِ خداوندی کو ملک کا رائج الوقت قانون بنا کر نافذ کرنے کو قرآنی اصطلاح میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کہتے ہیں۔ یہ نہ کسی گروہ یا پارٹی کا کام ہے نہ وعظ و نصیحت کا معاملہ۔

(۱۳) فساد کو روکنا :۔ لاقانونیت پھیلانا یا قانونِ خداوندی سے سرکشی برتنا جرم ہے۔ اسے قرآن کی اصطلاح میں فساد کہتے ہیں، اور اس کے لئے قرآن نے سخت ترین سزائیں تجویز کی ہیں۔

(۱۴) مشاورت :۔ دنیا میں صحیح نظامِ معاشرہ کا فریضہ یہ ہے کہ مستقل اقدار کو معاشرہ میں نافذ اور رائج کرے۔ لیکن مستقل اقدار بنیادی اصولوں کی شکل میں ہوتی ہیں۔ ان اصولوں کی جزئیات ہر زمانے کے تقاضوں کے لحاظ سے نظامِ معاشرہ کو خود متعین کرنی ہوتی ہیں۔ از روئے قرآن، یہ کام کسی فرد کے سپرد نہیں کیا جاتا، بلکہ نمائندگانِ ملت کے باہمی مشورے سے طے پاتا ہے۔ لہٰذا اسلامی نظامِ مملکت میں مشاورت بھی مستقل قدر ہے۔ لیکن یہ مشاورت مغرب کے جمہوری نظام کی طرح نہیں جس میں فیصلہ ووٹوں کی تعداد کی بنا پر کیا جاتا ہے۔ بلکہ یہ مشاورت مستقل اقدار کے حدود کے اندر رہتے ہوئے جزئی معاملات طے کرنے کے لئے ہوتی ہے۔

(۱۵) صحیح معاشرہ میں اربابِ حل و عقد دراصل متاعِ ملت کے امین ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ امانت انہی کے سپرد کی جائے جو اس کی حفاظت کے اہل ہوں۔

(۱۶) معاشرہ یا نظامِ مملکت کے قیام کے بنیادی مقاصد میں سے یہ بھی ہے کہ تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریات کا مہیا کرنا اس کے ذمہ ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ جو مملکت قوانینِ خداوندی کے نفاذ کے لئے وجود میں آتی ہے وہ ان تمام ذمہ داریوں کو اپنے اوپر لیتی ہے جنہیں خدا نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ یہ مملکت تمام افرادِ معاشرہ کو اس امر کی ضمانت دیتی ہے کہ ہم تمہارے اور تمہاری اولاد کے رزق کے ذمہ دار ہیں۔ اور تمہاری صلاحیتوں کے نشوونما کے ذمہ دار بھی۔

(۱۷) وسائلِ رزق کا تمام نوعِ انسانی کے لئے کھلا رہنا بھی مستقل قدر ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ خدا وہ ہے جس نے وہ سب کا سب جو زمین میں ہے تم سب کے فائدے کے لئے پیدا کیا ہے۔ یعنی اس لئے پیدا کیا ہے کہ تم سب اس سے متمتع ہو۔ اس لئے نہیں کہ چند افراد یا کوئی خاص گروہ اس پر قابض ہو کر بیٹھ جائے۔ چنانچہ جو نظام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریات کا ذمہ دار ہو، ضروری ہے کہ ذرائعِ رزق اس کی تحویل اور نگہداشت

میں رہیں۔

(۱۸) نہ صرف یہ کہ ذرائع رزق اور وسائل پیداوار کو ذاتی ملکیت نہیں بنایا جا سکتا، بلکہ یہ بھی کہ جو کچھ کسی کے پاس اس کی جائز ضرورت سے زاید ہو، اسے بھی انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے کھلا رکھا جاتا ہے۔

(۱۹) یہ سب اس لئے کیا جاتا ہے کہ دوسروں کی پرورش ایک مستقل قدر ہے۔ اس سے خود ہماری ذات مستحکم ہو جاتی ہے۔

(۲۰) **عصمت کی حفاظت:-** از روئے قرآن، عصمت کی حفاظت بھی ایک مستقل قدر ہے۔ مرد اور عورت کا جنسی تعلق صرف نکاح کے معروف طریقے سے جائز ہے۔ زنا بے حیائی کا کام ہے اور نہایت بُرا راستہ۔ جو اس فعل کا مرتکب ہو، اسے سزا دی جائے گی۔ نکاح بالغ مرد اور عورت کی باہمی رضامندی سے ہوتا ہے۔ نکاح سے مقصود محض جنسی جذبہ کی تسکین نہیں۔ اس سے مطلوب باہمی مودّت اور رحمت کے تعلقات استوار کرنا ہے۔ جس شخص کے لئے نکاح کی صورت پیدا نہ ہو سکے، وہ ضبطِ نفس سے کام لے اور اپنی عصمت کی حفاظت کرے۔

(۲۱) بنی نوعِ انسان ایک ہی برادری کے افراد اور ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں، لہٰذا تمام نوعِ انسان کا ایک عالمگیر برادری اور ایک قوم کی حیثیت سے رہنا مقصودِ حیات ہے۔ قوموں اور گروہوں میں بٹے ہوئے انسانوں کو ایک عالمگیر برادری بنانے کا طریق یہ ہے کہ ان سب کے لئے ایک ضابطۂ قوانین یعنے (ONE-WORLD-GOVERNMENT) ہو۔ قرآن نے اپنے آپ کو تمام عالمِ انسانیت کے لئے مشترکہ ضابطۂ قوانین کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ لہٰذا، تمام نوعِ انسانی کا ایک ضابطۂ حیات کے مطابق ایک امت بن کر رہنا بھی مستقل قدر ہے۔

(۲۲) قرآن کی رُو سے بقائے دوام صرف اسی عمل کو حاصل ہے جو تمام عالمِ انسانیت کی نفع بخشی کیلئے کیا جائے۔ اس کے لئے وہ پہلا قدم یہ تجویز کرتا ہے کہ تمام انسان، بلا تمیز رنگ و نسل اور بلا تفریق قوم و ملک تمام ایسے امور میں باہمی تعاون سے کام لیں جو انسانیت کی تعمیر میں ممد و معاون ہوں اور ایسے کاموں میں کبھی ایک دوسرے کی مدد نہ کریں جو انسانیت کے لئے ضعف اور قانون سے سرکشی کا موجب بنیں۔

(۲۳) **معیارِ تفریق:-** قرآن میں انسانوں کی تفریق کا صرف ایک معیار ہے۔ جو لوگ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کا اقرار کریں، اور ان کا احترام اپنی زندگی کا نصب العین بنائیں، وہ ایک قوم کے افراد ہیں انہیں مومن کہا جاتا ہے۔ اور جو اس سے انکار کر کے اپنے خود ساختہ مسلک پر چلنا چاہیں، وہ دوسری قوم کے افراد، انہیں کافر کہا جاتا ہے۔ چنانچہ آئیڈیالوجی کی بنا پر اس تفریق کے علاوہ کوئی اور معیارِ تفریق و تقسیم نہیں۔ رنگ، نسل، خون، زبان اور وطن کا اختلاف انسانوں میں وجہِ تفریق نہیں بن سکتا۔

(۴۲) **مستقل اقدار کو کسی سے زبردستی نہیں منوایا جا سکتا**۔ از روئے قرآن 'دین میں کوئی زبردستی نہیں'۔ سیدھی اور غلط راہ واضح ہو چکی ہے۔ اس لئے جونسی راہ کسی کا جی چاہے اختیار کرے۔ قرآن مذہب کی شخصی آزادی دیتا ہے۔ اور غیر مسلموں کے معابد کی حفاظت قرآنی معاشرہ کا ذمہ قرار دیتا ہے۔ لیکن جب کوئی شخص برضا ورغبت اسلام قبول کرکے مسلم معاشرہ کا فرد بن جائے تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اسلامی قوانین کی اطاعت کرے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اسلامی معاشرہ یا اسلامی مملکت کا فرد بن جانے کے بعد اسے اس کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ جس قانون کی جی چاہے اطاعت کرے، اور جس سے جی چاہے' یہ کہہ کر انحراف کرے کہ دین میں کوئی زبردستی نہیں۔ اگر وہ ان قوانین وضوابط کی پابندی نہیں کرنا چاہتا تو اسے اجازت ہے کہ وہ دائرہ اسلام سے نکل کر کوئی اور مذہب اختیار کرلے۔

مندرجہ بالا سطور میں قرآن کی بیان کردہ مستقل اقدار میں سے بڑی بڑی اقدار کا مختصر الفاظ میں ذکر آ گیا ہے۔ دراصل مستقل اقدار کا سرچشمہ خود ذاتِ خداوندی ہے۔ قرآن کے اندر جو صفاتِ الٰہیہ بیان کی گئی ہیں ان میں سے چند ایک (مثلاً، هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وغیرہ کو چھوڑ کر باقی صفات مستقل اقدار ہیں۔ قرآن نے انہیں اسماء الحسنٰی کہہ کر پکارا ہے۔ ان صفاتِ خداوندی کو بطورِ معیار سامنے رکھ کر اپنے اندر انسانی ممکنات کو مشہود کئے جانا مقصدِ دین اور مطلوبِ حیات ہے۔ جوں جوں انسانی ذات میں استحکام پیدا ہوتا جائے گا۔ اس میں ان صفات یعنے مستقل اقدار کی نمود ہوتی جائے گی۔ خالقِ کائنات نے جس طرح باقی ہر شے کی تخلیق کے ساتھ اسکے امکانات اور صلاحیتوں کے پیمانے مقرر کر دیئے ہیں' اسی طرح انسانی ذات کے لئے بھی پیمانے دے دیئے ہیں تاکہ جو کچھ اس ذات نے آخر الامر بننا ہے وہ بن جائے۔ اور یہ مستقل اقدار ہی انسانی ذات کے پیمانے ہیں۔

مسائلِ حیات کا حل

حضرات! اب میں چند ایک مسائل' جو انسانی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں' بیان کرکے یہ واضح کروں گا کہ وحی کی دی ہوئی مستقل اقدار کس طرح انسانی زندگی پر اثرانداز ہوتی ہیں۔ کس طرح (PEACE AND PLENTY) کی تلاش میں انسان تمام عمر مارا مارا پھرتا ہے اور کس طرح وحی کے بغیر مادی وسائل میسر آ جانے کے بعد بھی امن نہیں ملتا۔ دنیا کی تمام نعمتیں پا لینے کے باوجود خوف وحزن دور نہیں ہوتا۔ اور (PROCESS OF TRIAL AND ERROR) کے ذریعے انسانیت کی ارتقاء میں کتنی رکاوٹیں سامنے آتی ہیں جو وحی کی ہدایت پر عمل پیرا ہونے سے خود بخود دور ہو جاتی ہیں۔

(۱) **جمہوریت**:۔ آج ہر طرف دنیا میں جمہوریت کی پکار ہے۔ لیکن جمہوریت کی تعریف کیا ہے کسی کو معلوم نہیں۔ خود پاکستان کے اندر یہ ایک اختلافی مسئلہ بنا ہوا ہے۔ برسرِ اقتدار طبقہ کہتا ہے کہ جمہوریت وہ ہے جس کو

ہم چلا رہے ہیں۔ مخالف پارٹیاں کہتی ہیں کہ جمہوریت وہ ہے جسے ہم چلاتے رہے ہیں۔ دونوں کی نظر مغرب کے نظامِ جمہوریت کی طرف ہے، قرآن پر نظر نہ ان کی ہے نہ اُن کی۔ اقوامِ مغرب کے ہاں جمہوریت کی بنیاد حسب ذیل مفروضات پر ہے:۔

۱۔ اس نظام میں حاکم اور محکوم کا امتیاز باقی نہیں رہتا۔ عوام کی حکومت، عوام کے مفاد کی خاطر اور عوام ہی کی وساطت سے، کا اصول اس کی بنیاد ہے۔

۲۔ عوام کی منشا ان کے نمائندگان کے ذریعے معلوم ہو سکتی ہے۔

۳۔ کسی چیز کے غلط یا صحیح ہونے کا معیار ان نمائندگان کی کثرت رائے ہوتا ہے۔

۴۔ اقلیت کو اکثریت کے فیصلے صحیح تسلیم کرنے پڑتے ہیں۔

لیکن آج مفکرینِ مغرب، جن کے ذہن کی یہ پیداوار ہے، ان مفروضات کے خلاف آواز بلند کر رہے ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ حاکم اور محکوم کو ایک تصور کرنا عملی ناممکنات میں سے ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ اگر ایک بات کو لاکھ آدمی بھی صحیح کہہ دیں تو وہ صحیح نہیں ہو سکتی۔ فیصلہ صحیح وہ ہوتا ہے جو در اصل صحیح ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ اس مفروضہ کو صحیح تسلیم کر کے، کہ قوم کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہے، بحث اس بات پر شروع ہو جاتی ہے کہ اقتدار کسی فرد واحد کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے یا کسی جماعت کے۔ لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ کیا انسانوں کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ بلا حدود و قیود قوانین وضع کریں۔ چنانچہ اب وہ اس بنیاد ہی کو غلط قرار دے رہے ہیں جس پر جمہوریت کی بنیاد اٹھتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جمہوریت کے خلاف سب سے بڑی اصولی دلیل یہ ہے کہ یہ ایک ایسا اندازِ حکومت تصور کیا جاتا ہے جس میں ہر انسان دخیل ہوتا ہے۔ لیکن حکومت ایک خاص فن ہے اور بڑی مشکل سائنس۔ اور ہر شخص میں نہ اس کی صلاحیت ہو سکتی ہے نہ اس کا مذاق۔ نہ اس کے لئے فرصت نہ میدان، کہ وہ اس فنی سائنس کا درک حاصل کر سکے۔ مغربی مفکرین کو اب اس کا احساس ہے کہ اگر جمہوریت کی تعریف یہ ہے کہ لوگ اپنی حکومت آپ کریں، تو یہ ایک ایسی چیز کا بیان ہے جس کا وجود ناممکنات میں سے ہے اور جو نہ کبھی پہلے وجود میں آئی ہے اور نہ آج کہیں موجود ہے۔ وہ اب سمجھ رہے ہیں کہ یہ دو متضاد چیزیں ہیں کہ ایک ہی قوم بیک وقت حاکم بھی ہو اور محکوم بھی۔ یہ بیان کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ خود مغربی جمہوریت کے موجد اب یہ محسوس کر رہے ہیں کہ اس نظام کی بنیاد غلط ہے۔ لیکن 'پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الٰہ الا اللہ' ـــــ کہنے والوں کے ذہن اس احساس سے خالی ہیں۔ وہ برابر اس فروعی مسئلے پر جھگڑ رہے ہیں کہ صدارتی طرزِ حکومت بہتر ہے یا پارلیمانی۔ اس کوتاہ نظری میں ملّا اور مسٹر دونوں برابر ہیں۔ دونوں مغرب کی لادینی حکومت کے ابلیسی نظام کو اپنے مسائل کا حل قرار دے رہے ہیں۔ لیکن اس اندھیرے میں محترم پرویز صاحب ایک واحد شخص ہیں جو

بیس برس سے برابر ان چمکا ذروں کو قرآن کی روشنی دکھا رہے ہیں۔ وہ برابر پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ مغرب کا جمہوری نظام اسلامی نظام سے الگ شے ہے۔ اسلامی نظام میں (SOVEREIGNTY) اللہ کی ہوتی ہے۔ یعنی اللہ کے غیر متبدل قوانین کی ہوتی ہے جو اس کی واحد، آخری اور مکمل کتاب کے اندر موجود ہیں۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، مغربی جمہوری نظام میں آخری فیصلہ کا حق اکثریت کو ہوتا ہے۔ اس نظام میں نہ کوئی چیز مطلق حق ہے، نہ مطلق باطل۔ لیکن دوسری طرف قرآن حق اور باطل کے مستقل اور مطلق معیار مقرر کرتا ہے جس چیز کو اس معیار نے صحیح قرار دیا وہ ہمیشہ صحیح ہے، چاہے سو فیصد انسان اسے باطل قرار دیں۔ مغربی جمہوریت کا نظریہ یہ ہے کہ حق اور باطل کے تعین میں اکثریت کبھی غلطی نہیں کر سکتی۔ حالانکہ تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ نوعِ انسانی کی اکثریت عام طور پر صحیح راستے پر نہیں ہوتی۔ قرآن اس کی تائید کرتا ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ انسانوں کی اکثریت کبھی حق پر اکٹھی ہو ہی نہیں سکتی۔ بلکہ یہ کہ اگر یہ اکٹھی ہو بھی جائے تو حق کو پرکھنے کا معیار یہ نہیں کہ چونکہ اکثریت اس پر جمع ہو گئی ہے اس لئے یہ حق ہے۔ جیسا کہ مستقل اقدار کے ضمن میں عرض کر چکا ہوں۔ قرآن نے ایسے اصول دے دیئے ہیں جو تمام نوعِ انسانی کے لئے غیر متبدل ہیں۔ یہ بنیادی اصول اسلامی معاشرے کے تمام خط و خال متعین کرتے ہیں۔ اس لئے ان اصولوں کے متعلق یہ تصور ہی غلط ہے کہ ان کے صحیح یا غلط ہونے کے لئے رائے شماری کی جائے۔ چنانچہ اسلامی نظام کا یہ حصہ جمہوری تصورات سے یکسر الگ ہے۔ البتہ ان اصولوں کی روشنی میں ہر زمانے کی ملتِ اسلامیہ اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق جزئی قوانین خود مرتب کرے گی۔ اور قوانین کی تنفیذ کے لئے ایک مشنری وضع کرے گی۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کے لئے قرآن مشاورت کا حکم دیتا ہے۔ چنانچہ اسلامی نظام (PERMANENCE AND CHANGE) کا حسین امتزاج ہے۔

برادران! آج پاکستان میں صحت مند نظامِ حکومت قائم کرنے کے لئے صدارتی یا پارلیمانی طرزِ حکومت جیسے فروعی مسائل میں الجھنے کی ضرورت نہیں۔ کرنے کا کام یہ ہے کہ قرآن کی دی ہوئی مستقل اقدار کو ملکی قوانین کی بنیاد قرار دیا جائے۔ لیکن اس مسئلہ کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔ مسٹر اس لئے نہیں دیتا کہ یہ اس کے بس کی بات نہیں اور ملا اس لئے نہیں دیتا کہ یہ اس کی مصلحت کا تقاضا ہے۔

مستقل اقدار اور قوموں کا عروج و زوال

حضرات! اب میں اس نکتے کو بیان کروں گا کہ قرآن نے قوموں کے عروج و زوال کے قوانین مقرر کر کے کس طرح ایک صحت مند معاشرے کے قیام میں مدد دی ہے۔ یہ بھی محترم پرویز صاحب کے الفاظ میں سنیئے ——— از روئے قرآن جس طرح کائنات کا یہ عظیم سلسلہ خدا کے قوانین کے مطابق چل رہا ہے اسی طرح انسانی دنیا کے لئے قوانین مقرر ہیں۔ یہ وہ قوانین ہیں جن کا اطلاق ان کی طبعی زندگی اور ان کی ذات دونوں

پر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اقوام کے لئے بھی قوانین مقرر ہیں جن کے مطابق ان کے عروج و زوال اور ان کی موت و حیات کے فیصلے ہوتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر ایک قوم خدا کے متعین کردہ قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتی ہے، یعنی ایسا نظام اور معاشرہ متشکل کرتی ہے جس کی بنیادیں خدا کے مقرر کردہ قوانین پر استوار ہوں تو اس قوم کو سرفرازیاں اور سربلندیاں نصیب ہوتی ہیں۔ اور اگر وہ ان قوانین کی خلاف ورزی کرتی ہے تو وہ تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ اس کا نام اجتماعی قانونِ مکافاتِ عمل ہے، اور یہ اسی طرح اٹل اور غیر متبدل ہے جس طرح افراد کے لئے قانونِ مکافات۔ قرآن کی رُو سے تاریخ اسی اجتماعی قانونِ مکافات کے ریکارڈ کا نام ہے۔ یعنی یہ بتاتی ہے کہ کس کس قوم نے کس کس نظریۂ زندگی کے مطابق عمل کیا، اور ان میں سے ہر ایک کا کیا انجام ہوا۔ اسی لئے قرآن تاریخ کو بڑی اہمیت دیتا ہے اور اسے اپنے دعاوی کی صداقت کے لئے بطور شہادت پیش کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن جہاں وہ واضح قوانین دیتا ہے جن کے مطابق قوموں کی موت و حیات کے فیصلے ہوتے ہیں، وہاں اس کے ساتھ اقوامِ سابقہ کی تاریخ بیان کرتا ہے جس سے ان قوانین کی صداقت پرکھی جا سکتی ہے۔ غلط نظامِ معاشرت اپنے تباہ کن نتائج کو روزِ اول ہی سے مرتب کرنا شروع کر دیتا ہے۔ لیکن وہ اثرات بڑے غیر محسوس ہوتے ہیں اور انہیں صرف وہی آنکھ دیکھ سکتی ہے جس پر مفاد پرستیوں کے پردے نہ پڑے ہوں۔ یہ نتائج اندر ہی اندر آگے بڑھتے رہتے ہیں تا آنکہ ایک دن محسوس شکل میں سامنے آ جاتے ہیں۔ لیکن یہ اسباب ان کے غلط نظام کے تباہ کرنے کے ذرائع ہوتے ہیں۔ اس کا اصل سبب ان کی غلط روشِ زندگی ہوتی ہے۔ وہ لوگ جو تاریخ کو صرف واقعات و حوادث کا ریکارڈ سمجھتے ہیں، ان محسوس اسباب کو ان کی تباہی کا سبب قرار دیتے ہیں۔ لیکن قرآن جو تاریخ کو ایک سائنس اور فلسفہ کی حیثیت سے پیش کرتا ہے، ان واقعات و حوادث کو چنداں اہمیت نہیں دیتا۔ وہ علاماتِ مرض کے بجائے علتِ مرض کی نشاندہی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ان کی تباہی کا اصل سبب وہ تھا۔ قرآن اس قانون کو جس کی رُو سے قوموں کی موت و حیات کے فیصلے ہوتے ہیں، سنتہ اللہ سے تعبیر کرتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ قانونِ مکافاتِ عمل شروع سے اسی طرح چلا آتا ہے اور غیر متبدل ہے۔ ہیگل اور مارکس کے فلسفہ کی رُو سے نہ کائنات کے سامنے کوئی مقصد اور منزلِ مقصود ہے نہ کوئی تصور فی ذاتہٖ خیر و شر ہے، نہ کسی تصور یا نظام میں آگے بڑھنے اور باقی رہنے کی صلاحیت ہے، نہ ہی اس کارگہِ ہست و بود کے پیچھے کوئی ایسی قوت جو اس عظیم سلسلہ کو کسی مقصد کے مطابق چلا رہی ہے۔ یہ اندھی قوتیں ہیں جو میکانکی طور پر مصروفِ کشمکش ہیں۔ لیکن قرآن نے اس سے یکسر مختلف فلسفہ تاریخ پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کائنات میں حق اور باطل کی کشمکش ہر وقت جاری ہے۔ حق اٹل، مستحکم اور غیر متبدل ہے اور اس کا نتیجہ تعمیری ارتقا ہے۔ اس کے برعکس باطل ہر وقت بدلتا رہتا ہے

اور اس کا نتیجہ تخریب ہے۔ حق اور باطل کے ٹکراؤ میں حق بالآخر غالب آتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ حق اور باطل کی کشمکش اور آخرالامر حق کا غلبہ اور باطل کی شکست کا مقصد کیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ خدا نے یہ سلسلۂ کائنات بالمقصد پیدا کیا ہے۔ یونہی بیکار پیدا نہیں کیا۔ اور کائنات کی تمام قوتیں اس لئے سرگرمِ عمل ہیں کہ ہر عمل اپنا صحیح صحیح نتیجہ پیدا کرے۔ چونکہ کائنات کو بالحق پیدا کیا ہے، یعنی تعمیر و ارتقا کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور کائنات کی تمام قوتیں اس لئے سرگرمِ عمل ہیں کہ ہر عمل اپنا صحیح صحیح نتیجہ پیدا کرے۔ اسلئے ہر وہ تصور، ہر وہ عمل، ہر وہ نظامِ زندگی جو حق (مستقل اقدار) کے مطابق ہو، وہ زندہ رہے گا اور آگے بڑھے گا، جو اس کے خلاف جائے گا اور تعمیرِ انسانیت کے لئے مضر ہوگا وہ تباہ ہو جائے گا۔ کہا جائے گا کہ یہ روزمرّہ کا مشاہدہ ہے کہ دنیا میں مستبد قوتیں کمزوروں کو دبائے رکھتی ہیں اور ان کا کچھ بھی نہیں بگڑتا۔ لیکن کسی تصوّرِ حیات، نظامِ زندگی یا اس تصور و نظام کی حامل قوم کی کیفیات کا مشاہدہ ایک دن میں نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے صدیاں درکار ہوتی ہیں۔ قومیں، نہ ایک دن میں بنا کرتی ہیں اور نہ ایک دن میں تباہ ہوتی ہیں۔ ان کے اعمال کے نتائج لمحہ بہ لمحہ مرتب ہوتے رہتے ہیں۔ اور جب تک کسی قوم کے اچھے اعمال کا پلڑا جھکا رہتا ہے، وہ قوم زندہ رہتی ہے اور آگے بڑھتی جاتی ہے۔ اور جب غلط کاموں کا پلڑا جھک جاتا ہے تو قوم کا تنزل شروع ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ تعمیری امور، تخریبی امور کے نقصان دہ اثرات کو ساتھ ہی ساتھ زائل کرتے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر تخریبی امور کا پلڑا جھکتا چلا جائے تو وہ قوم بتدریج اور غیر محسوس انداز سے ہلاکت کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اگر وہ قوم ہلاکت سے پہلے اپنی روش کی اصلاح کر لے تو وہ تباہی سے بچ جاتی ہے، لیکن اگر ایسا نہیں کرتی تو تباہی کے جہنم تک پہنچ جاتی ہے، اور پھر اس کے لئے بازآفرینی کا موقعہ نہیں رہتا۔ جس طرح ہر مرض اور اس کی وجہ سے آنے والی موت کے درمیان وقفہ ہوتا ہے، اسی طرح نظامہائے تمدن و معیشت کی خرابی اور اس کی وجہ سے آنے والی ہلاکت میں بھی مہلت کا وقفہ ہوتا ہے جس کی آخری حد کو قرآن اجل کے نام سے پکارتا ہے۔ قوموں کی تباہی کے انداز بھی مختلف ہوتے ہیں۔ پوری پوری قومیں طبعی طور پر تباہ ہوتی رہتی ہیں لیکن قرآن کہتا ہے کہ قوموں کی ہلاکت سے دراصل مراد یہ ہے کہ اس قوم کا غلبہ اور حکومت چھن جاتی ہے اور اس کی جگہ کوئی اور قوم لے لیتی ہے۔ کسی قوم کی بقا کے لئے قرآن نے اصول یہ دیا ہے کہ اسکے عروج و زوال کا فیصلہ اس نظام کے مطابق ہوتا ہے جسے وہ قوم اپنے لئے اختیار کرتی ہے۔ اور دنیا میں نظامِ معاشرہ باقی وہی رہ سکتا ہے جو تمام نوعِ انسان کے لئے نفع رساں ہو، یعنی جس کی عمارت قرآن کی مستقل اقدار پر استوار ہو۔ اگر ایک قوم کے پاس علم و عقل بھی وافر ہو اور فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے کی بنا پر اسے دولت اور قوت بھی حاصل ہو، لیکن اس کے باوجود اس کا نظام غلط بنیادوں پر استوار ہو تو اسے نہ استحکام مل سکتا

ہے نہ اطمینان۔

مستقل اقدار اور خارجی کائنات

حضرات! اب میں عرض کرونگا کہ دینی تعلیم (SCIENTIFIC PROGRESS) کی نقیض نہیں، بلکہ قرآن تسخیرِ کائنات پر بار بار زور دیتا ہے، لیکن اس مقصد کے لئے کہ اس کے ماحصل کو بنی نوعِ انسان کی منفعت کے لئے استعمال کیا جائے۔ قرآن جہاں اپنے قوانین کی صداقت کے ثبوت میں تاریخ کو پیش کرتا ہے، وہاں دوسری طرف بار بار کائنات کی طرف اشارے کرتا ہے۔ قرآن نے اسے بڑی اہمیت دی ہے کہ کسی فرد یا قوم کا خارجی کائنات کے متعلق زاویہ نگاہ کیا ہے۔ چنانچہ افراد یا اقوام کی موت و حیات کے فیصلے کے لئے یہ بھی ایک اہم عنصر ہے۔

جس وقت قرآن کا نزول ہوا، اس وقت دنیا کے مذاہب کائناتی قوتوں کو معبود بنا کر ان کے سامنے سجدہ ریز تھی۔ اور اس وقت کا (INTELLIGENTSIA) اور عالمِ تصوف دونوں کائنات کو باطل اور قابلِ نفرت قرار دے رہے تھے۔ قرآن آیا، اور اس نے پکار کر کہا کہ آدمی کا مقام یہ ہے کہ فطرت کی تمام قوتیں اس کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ خدا نے چاند اور سورج کو تمہارے تابع تسخیر کر دیا ہے، اس نے دن اور رات کو تمہارے تابع فرمان بنا دیا ہے، اس نے دریاؤں اور سمندروں کو غرضیکہ کائنات کی بلندیوں اور پستیوں میں جو کچھ ہے سب تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔ قرآن نے اس اعلان سے انسانی دنیا کا نقشہ بدل دیا۔ ذہنِ انسانی کے تراشیدہ معبود خود انسان کے آگے سجدہ ریز ہو گئے۔ کائنات کے متعلق زاویۂ نگاہ بدلنے کے بعد قرآن نے علم بالحواس کے متعلق انسانی نکتہ نظر میں تبدیلی پیدا کی۔ اس نے کہا کہ جس بات کا تمہیں علم نہ ہو، اس کے پیچھے نہ لگا کرو۔ پھر کہا کہ تمہارے سمع و بصر اور فواد یعنی (MIND) سے پوچھا جائے گا کہ کیا تم نے اس بات کے صحیح ہونے کی شہادت دی تھی؟ یعنی قرآن نے علم اسے قرار دیا ہے جس کی گواہی آنکھ، کان اور فواد دیں۔ آنکھ اور کان سے کام نہ لینے والوں کو قرآن نے جہنمی قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ یہ لوگ انسان نہیں حیوان ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گم کردہ راہ۔ اس لئے کہ یہ حقائقِ کائنات سے بے خبر رہتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ ایک دوسرے گروہ کا ذکر کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ کائنات کی بلندیوں اور پستیوں کی تخلیق اور رات دن کی گردش میں صاحبانِ عقل و شعور کے لئے بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اٹھتے، بیٹھتے، لیٹتے، ہر وقت قوانینِ خداوندی کو سامنے رکھتے ہیں اور تخلیقِ ارض و سما میں انتہائی غور و فکر کرتے ہیں۔ اور اپنے مسلسل تجربات و پیہم مشاہدات کے بعد علیٰ وجہ البصیرت اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! تو نے اس عظیم سلسلہ کائنات کو باطل پیدا نہیں کیا۔ قرآن، کائنات پر غور و فکر کرنے والوں کو علماء کہہ کر پکارتا ہے (۳۵/۲۸) اور کہتا ہے کہ ہم انہیں انفس و آفاق میں اپنی نشانیاں دکھاتے جائیں گے تاکہ یہ بات

نکھر کر سامنے آجائے کہ قرآن ایک حقیقتِ ثابتہ ہے۔ جو قومیں سمع و بصر اور فواد سے کام لے کر تسخیرِ کائنات کرتی ہیں اور پھر فطرت کی قوتوں کو قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرتی ہیں وہ مومن اور متقی ہیں۔ ان کی دنیا کی زندگی بھی تابناک اور آخرت کی بھی درخشندہ۔ جو قومیں تسخیرِ فطرت تو کرتی ہیں لیکن قرآن کی مستقل اقدار کا اتباع نہیں کرتیں وہ صرف مقامِ آدمیت تک پہنچتی ہیں، مومن اور متقی کے مقام تک نہیں پہنچتیں۔ وہ اس دنیا میں قوت و شوکت حاصل کر لیتی ہیں لیکن مستقبل ان کا تاریک ہوتا ہے۔ لیکن جو قومیں سرے سے تسخیرِ فطرت کرتی ہی نہیں، ان کا مومن اور متقی ہونا تو درکنار، وہ مقامِ آدمیت تک بھی نہیں پہنچ سکتیں۔ ان کے لئے دنیا میں بھی ذلت و خواری اور آخرت میں بھی تباہی و بربادی ہے۔

قرآن کا فلسفۂ جہاد

حضرات! اب میں عرض کروں گا کہ جس طرح دریا کا پانی بند توڑ دینے کے بعد سیلاب بن کر تباہی مچاتا ہے اور بند کے اندر رہنے سے انسان کی منفعت اور خوشحالی کے لئے استعمال ہوتا ہے اسی طرح انسانی جذبات کو اگر (CHANNELISE) کر دیا جائے اور مستقل اقدار کے تابع کر دیا جائے تو وہ کس طرح انسانیت کی نشو و نما کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ اس نکتہ کی وضاحت کے لئے میں قرآن کا فلسفۂ جہاد محترم پرویز صاحب کے الفاظ میں بیان کر کے یہ واضح کروں گا، کہ کس طرح جنگ جیسی مہیب چیز مستقل اقدار کے تابع رہ کر انسانیت کے لئے باعثِ رحمت بن جاتی ہے

یورپ نے صلیبی جنگوں میں شکست کے بعد انتقام لینے کے لئے ایک منظم لیکن خاموش پروپیگنڈہ کے ذریعے دنیا کی نگاہوں میں اسلام کی ایک ایسی بھیانک اور خوفناک تصویر کھینچی ہے کہ آج دنیائے تہذیب و تمدن میں جہاں کہیں اسلام کا نام آتا ہے، قتل و غارت گری، ہلاکت و خونریزی، جور و ظلم کے خونین مناظر آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہاں جہاں سے مسلمان قوم گزری، آبادیاں ویرانوں میں تبدیل ہو گئیں، کتب خانے جل کر راکھ ہو گئے، بڑے بڑے محلات اور تہذیب و تمدن کے نشانات کھنڈرات میں تبدیل ہو گئے۔ نہ عبادت گاہیں محفوظ رہیں نہ عورتیں اور نہ بچے۔ یہ تصویر اس اسلام کی بتائی جاتی ہے جس کی تعلیم کی خصوصیتِ کبریٰ یہ ہے کہ وہ سلامتی کی راہ دکھاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اے اہلِ کتاب! اللہ کی طرف سے تمہارے پاس وہ روشنی اور کتاب آچکی ہے جس کا بتایا ہوا راستہ نوعِ انسانی کو اس منزل تک لے جاتا ہے جسے امن و سلامتی کا گھر کہا جاتا ہے۔ خود لفظ اسلام کے معنی امن و سلامتی کے ہیں۔ اسلام کی بنیادی تعلیم امن اور سلامتی کا پیام ہے۔ قرآن صاف صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ دنیا میں تباہی اور خرابی پیدا کرنے والا مسلک کبھی خدا پسند نہیں ہو سکتا۔ وہ غیر مبہم الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ چونکہ جنت امن اور سلامتی کا گھر ہے اس لئے اس میں ان لوگوں کا گذر نہیں ہو سکتا جو دنیا میں سرکشی اور طغیان کی روش اختیار

کرکے فساد برپا کرتے ہیں۔ وہ اممِ سابقہ کی تباہیوں کی عبرت انگیز داستانیں بیان کرتا ہے تو اس لئے کہ اس حقیقت کو واضح کر دیا جائے کہ فتنہ و فساد شرفِ انسانیت کے کس قدر خلاف ہے۔ وہ اممِ سابقہ کے احوال و کوائف بیان کرنے کے بعد بصد تأسف کہتا ہے کہ ان میں ایسے لوگ کیوں نہ پیدا ہوئے جو انہیں فساد انگیزیوں اور فتنہ پردازیوں سے روکتے۔ وہ نبی اکرمؐ کی بعثت کا مقصد یہ بیان کرتا ہے کہ ظہورِ اسلام سے پہلے دنیائے فکر و عمل کے ہر گوشے میں فساد رونما ہو چکا تھا اور اس فساد کو مٹانے کے لئے نظامِ خداوندی کی ضرورت تھی۔ وہ فساد کو ایمان اور عملِ صالح کی ضد قرار دیتا ہے کہ یہ دونوں ایک جگہ اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ کہئے! جس نظامِ زندگی کے بنیادی عناصر یہ ہوں اس کی تصویر وہ ہو سکتی ہے جو اہلِ یورپ نے کھینچی ہے؟ مسلمان کی تو کیفیت یہ ہے کہ کسی کے خلاف ہاتھ اٹھانا تو ایک طرف، وہ غیر مذہب والوں کی گالی کا جواب بھی گالی سے نہیں دے سکتا۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس سے ان انبیائے کرامؑ میں سے کسی کی توہین ہو جن پر ایمان لانا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے۔ یہ تو تھا دوسروں کے جذبات کا احترام۔ معاملات میں جس شدت و تکرار کے ساتھ عدل و انصاف کی تعلیم قرآن میں آئی ہے اس کی نظیر شاید ہی کہیں ملے۔ مجرم کی مدد کو وہ جرمِ عظیم قرار دیتا ہے۔ قرآن کا معیارِ عدل اس قدر بلند ہے کہ وہ اس بات کی تاکید کرتا ہے کہ دیکھنا کسی گروہ کی دشمنی تمہیں اس بات پر نہ ابھار دے کہ تم اس کے ساتھ انصاف نہ کرو۔ قرآن قتلِ ناحق کے خلاف شدید ترین سرزنش و عتاب کا پہلو بے نقاب کرتا ہے۔ اس تنبیہ کے باوجود اگر کوئی قانون کی خلاف ورزی کرے تو اس کے لئے قصاص کا عدل پرور آئین موجود ہے۔

مذہب اور دین کا فرق

اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ اگر اسلام جبر و اکراہ سے منع کرتا ہے اور امن و سلامتی کا مذہب ہے تو پھر تمام سلسلہ جنگ و جدال جس کے تذکرہ سے قرآن کی آیات اور کتبِ تاریخ و سیر بھری پڑی ہیں، کس لئے تھا۔ یہ سوال ان لوگوں کی طرف سے ہوتا ہے جنہوں نے اسلام کو مذہب سمجھ رکھا ہے، حالانکہ اسلام مذہب نہیں دین ہے۔ مذہب، خدا اور بندے کے درمیان ایک پرائیویٹ تعلق کا نام ہے جس کا انسان کی دنیاوی زندگی سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ دین اس نظامِ زندگی کا نام ہے جو انسانی زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہو۔ لفظ دین کی جامعیت کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل حقائق پر نگاہ ڈالئے۔

(۱) انسان مدنی الطبع ہے اس لئے حیاتِ اجتماعی اس کی زندگی کا خاصہ ہے۔

(۲) حیاتِ اجتماعیہ کی ترتیب و تشکیل کا نام مملکت ہے۔

(۳) مملکت کے لئے ایک نظام کی ضرورت ہوتی ہے۔

(۴) اس نظام کا قیام و استحکام قوت پر منحصر ہے۔

(۵) انسانوں نے جس قدر نظامہائے مملکت تجویز کئے ہیں وہ سب اس اصول پر مبنی ہیں کہ بعض انسانوں کو دوسرے انسانوں کے لئے قانون سازی کا حق حاصل ہے۔

(۶) انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کی اساس مصالح مملکت پر ہوتی ہے ضابطہ انسانیت پر نہیں۔

(۷) ضابطہ اخلاق کا دائرہ مذہب سمجھا جاتا ہے جس کی بنیاد خدا یا کسی اور ہستی کی پرستش پر ہوتی ہے۔

(۸) مذہب اور سیاست کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور دونوں میں باہمی کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

(۹) اسلام ایک ایسا نظام مملکت پیش کرتا ہے جس میں اقتدار اعلےٰ صرف خدا کو حاصل ہوتا ہے اور مملکت اس کے قانون کو نافذ کرنے کا ایک ذریعہ ہوتی ہے۔

قوت کی ضرورت

اب ظاہر ہے کہ مملکت کوئی بھی ہو اس میں مجرمین کو قانون کے مطابق چلانے کے لئے قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہذا یہ وہ پہلا مقام ہے جہاں اس مملکت کو قوت کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ بھی واضح ہے کہ اس مملکت میں غیر مسلم بھی آباد ہونگے جن کے مال و جان، عصمت، مذہب اور معابد کی حفاظت کی ذمہ داری مملکت پر ہوگی۔ اس حفاظت کے لئے بھی قوت کی ضرورت ہوگی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ کبھی مملکت کے خلاف سازش کریں۔ اس کی مدافعت کے لئے بھی قوت کی ضرورت ہوگی۔ نیز یہ بھی ہوگا کہ دوسری مملکتیں اس جدید مملکت کی تشکیل میں مزاحمت کریں یا اس کے متشکل ہو جانے کے بعد اس کی تخریب کی کوشش کریں۔ ان کے ان جارحانہ اقدامات کو روکنے کے لئے بھی قوت کی ضرورت ہوگی۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ان مملکتوں کے درمیان جنگ کی بھی نوبت آجائے گی۔ اب یہ حقیقت سامنے آگئی کہ قرآنی مملکت کے قیام، استحکام اور بقا کے لئے مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے اور اس جدوجہد میں ایک ایسا مقام بھی آجاتا ہے جس میں جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے۔ قرآن اس مسلسل جدوجہد کو جہاد کہہ کر پکارتا ہے اور جنگ کے لئے قتال کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ اب غور کیجئے کہ قرآن کریم میں سب سے پہلے قتال کی اجازت جنگ بدر کے موقع پر دی گئی۔ یہ وہ موقع تھا جب ہجرت کے بعد بھی کفار نے مسلمانوں کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اور لشکر جرار لے کر مدینہ پر چڑھائی کر دی۔ اب وہ وقت آگیا تھا جب کہ مجاہدین کی جماعت یا ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی یا میدان جنگ میں نکل کر اپنی آخری بقا کی کوشش کرتی۔

اسلام دنیا کی ہر ملت کو مذہبی آزادی دیتا ہے اور اپنی آزادی کو برقرار رکھنا اپنا حق سمجھتا ہے۔ دوسرے مذاہب میں مذہبی آزادی سے مقصود پوجا پاٹ اور مذہبی رسوم کی ادائیگی کی آزادی ہے اور بس۔ مسلمان یہ مذہبی آزادی ہر ایک کو دیں گے لیکن ان کے نزدیک یہ آزادی ان کے دین کا صرف ایک گوشہ ہے۔ ان کا دین زندگی کے تمام پہلوؤں کو محیط

ہے۔ اس لئے ان کے ایمان کے مطابق مذہبی آزادی سے مفہوم ان کے نظامِ مملکت کی آزادی ہے۔ یہی ان کا دین ہے۔ چنانچہ جو لوگ اس نظامِ مملکت کے قیام میں مانع آئیں گے مسلمان ان کی ان کوششوں کو روکے گا۔ مخالف صلح و منافقی سے باز آجائیں تو بہتر ورنہ اگر انسانیت کا کوئی جذبہ ان میں باقی نہ رہے تو پھر مسلمان جاں بکف میدان میں آجائے گا۔ عہد و پیمان کی پابندی اسلام نظام کا بنیادی اصول ہے۔ مملکتِ اسلامیہ دوسری مملکتوں کے ساتھ امن و سلامتی کے معاہدات کرتی ہے۔ پھر جو قوم ان معاہدات کو توڑے ان سے بعض حالات میں جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے۔ جن غیر مسلم علاقوں میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت ہوگی وہاں لوگ اسلام قبول کریں گے۔ اگر ان پر کوئی قوم دست درازی کرے تو اسلامی مملکت پر ان کی امداد فرض ہوگی۔ ایسے موقع پر اگر صلح و آشتی اور عہد و پیمان سے بات نہ سلجھے تو ان مظلومین کی حفاظت اور ان پر ظلم و تشدد کی مدافعت میں جنگ لازم آئے گی۔ مظلوم کی آواز کہیں سے اٹھے، خدا کے سپاہی بلاتمیز مذہب و ملت اور بلالحاظ رنگ و وطن محض حق کی امداد کی خاطر ان مظلومین کی آواز پر لبیک کہیں گے۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر اللہ ایسا نہ کرتا کہ انسانوں کے ایک گروہ کے ذریعے سے دوسرے گروہ کو ظلم اور سرکشی سے باز رکھتا تو دنیا میں فساد ہی فساد برپا ہو جاتا۔ قرآن نے حزب اللہ کا فریضہ یہی قرار دیا ہے کہ اقوامِ عالم کے تنازعات میں حَکَم بنیں۔ تمام فیصلے عدل اور انصاف سے کریں۔ اور جو اس فیصلے سے سرتابی کر کے دنیا میں فساد برپا کرنا چاہے تو اس کا سر کچل کر رکھ دیں۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے کہ ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی امت بنایا ہے تاکہ نوعِ انسانی کے اعمال کی نگرانی کرو اور تمہاری نگرانی تمہارا رسول کرے۔ یہی وہ شکلیں ہیں جہاں دوسروں سے جنگ کرنے کی اجازت ہے۔ اس کے علاوہ نظامِ مملکت کے اندر باغیوں اور منافقوں کے خلاف بھی جنگ کا ذکر ہے۔

قرآن کیخلاف سازشیں

حضرات! یہ قرآن کی اس تعلیم کے چند پہلو ہیں جنہیں میں نے محترم پرویز کے الفاظ میں بیان کیا ہے اور جس پر عمل کرنے کے بعد چودہ سو سال پیشتر مسلمانوں نے اقوامِ عالم پر برتری حاصل کی تھی۔ اس تعلیم پر عمل کرنے کے بعد اس زمانے کی جاہل اور اجڈ عرب قوم برسوں کے اندر آسمان کی بلندیوں پر پہنچ گئی تھی لیکن آج اگر ہم غیر مسلموں کے سامنے یہ دعوے کرتے ہیں کہ انسانیت کی فلاح کا راز قرآن کے اندر موجود ہے تو وہ ہماری بات پر یقین نہیں کرتے — برادران! میرے طالب علمی کے زمانے میں لاہور کی سڑکوں پر ایک شخص پھرا کرتا تھا، بڑا تنومند، سرخ رنگ، چہرے پر خون دوڑتا ہوا دور سے دکھائی دیتا تھا۔ وہ جہاں جاتا تھا پہلے زور سے زمین پر ڈنڈا مارتا تھا اور کہتا تھا "طاقت کی گولی"۔ لوگ لپک لپک کر اس سے طاقت کی گولیاں خریدتے تھے۔ ہر ایک کی خواہش ہوتی کہ میرا رنگ بھی اسی طرح سرخ ہو جائے جس طرح کہ اس شخص کا ہے۔ آپ کا بھی یہ مشاہدہ ہوگا کہ لوگ ایک کمزور اور مریل

قسم کے طبیب کے پاس علاج کے لئے کم جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جو شخص اپنا علاج نہیں کر سکتا وہ دوسروں کا کیا کرے گا۔ چنانچہ اگر میں قرآن کی تعلیم یورپ کی کسی یونیورسٹی کے پروفیسر کے سامنے پیش کروں تو پہلے وہ سر سے لے کر پاؤں تک میری طرف دیکھیگا، اور یقیناً اسے شک گزرے گا کہ جو میں کہہ رہا ہوں وہ درست نہیں۔ وہ یقیناً کہے گا کہ اگر اس نسخہ میں انسانیت کے لئے شفا ہے تو تم مسلمان خود مریض کیوں ہو۔ برادران! ایسا کیوں ہوا کہ جس قوم نے قرآن کی تعلیم اور اس کے نتائج کو دو اور دو چار کی طرح اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، پھر وہ آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں میں کیوں جا گری۔ وہ کیا عناصر تھے جنہوں نے نہایت خاموشی کے ساتھ اسے مصاف زندگی سے پچھاڑ دیا؟ ہوا یہ کہ جب کھجوروں کی گٹھلیوں پر گزارہ کرنے والی اس قوم کو قرآن کی تعلیم پر عمل کرنے کے باعث تمکن فی الارض حاصل ہو گیا تو مخالف قومیں اسے برداشت نہ کر سکیں۔ اور یہ مخالف قومیں وہ تھیں جن میں اس زمانے کا بہترین (INTELLIGENTIA) موجود تھا۔ یہ رومن اور ایرانی قومیں بڑی پرانی تہذیب کی مالک تھیں۔ انہوں نے اس راز کو پا لیا کہ جب تک عرب قرآن پر عمل کرتے ہیں، دنیا کی کوئی قوم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ان کو شکست دینے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ ان کو قرآن پر عمل سے بیگانہ کر دیا جائے۔ یہ تاریخ کا بہت بڑا موڑ ہے اور یہ قرآن پر عمل سے بیگانہ کرنے کی داستان بڑی عجیب اور بڑی دلخراش ہے۔ برادران! ان سازشوں پر سے پردہ اٹھانے کا سہرا بھی اسی مرد حق گو کے سر ہے جسے ہم پرویز کہتے ہیں۔ سنیے یہ سازشیں کیا ہیں:۔

(۱) قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا اس لئے یہ مخالفین کے بس کا روگ نہ تھا کہ وہ اس کے الفاظ کو بدل سکیں۔ چنانچہ انہوں نے سوچا کہ الفاظ تو وہی رہیں لیکن ان کا تصور بدل دیا جائے۔ چنانچہ یہ پہلی سازش تھی کہ قرآن کے معنی وہ نہیں جو اس کے الفاظ سے لئے جاتے ہیں بلکہ اس کے باطنی معنی ہوتے ہیں۔ قرآن کے الفاظ ورد وظیفہ کے لئے ہیں اور وظائف سے عجیب نتائج نکلتے ہیں۔ مذہب کی حیثیت سے پہلے یہ جنتر منتر یہودیوں میں موجود تھے۔ بعد ازاں یہ چیزیں ہندوؤں کے اندر آگئیں اور پھر غیر مسلموں کی سازشی تدبیروں سے مسلمانوں میں آکر عین دین بن گئیں۔ اب ہزار برس سے مسلمان اسے سینے سے لگائے پھرتا ہے اور اسی ورد وظیفے کا نام قرآن پر عمل ہے۔

(۲) قرآن پر عمل سے بیگانہ کرنے کی دوسری سازش یہ تھی کہ الفاظ قرآنی کی غیر قرآنی تفسیر پیش کی گئی اور اس تفسیر کو نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کیا گیا۔

(۳) اگلی سازش۔ یہ کہا گیا کہ جو کچھ بھی حضورؐ فرماتے تھے وہ ان کی اپنی طرف سے نہ تھا بلکہ یہ خدا کی طرف سے وحی ہوتی تھی۔ یعنی یہ وحی قرآن سے الگ ایک وحی تھی۔ اس سازش کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن پر بار بار غور و فکر کی جو

تاکید ہے اسے نگاہوں سے اوجھل کر دیا گیا۔

(۴) قرآن پر عمل سے بیکار کرنے کی اگلی سازش جس کی وجہ سے مسلمانوں نے عقل و فکر سے کام لینا یکسر چھوڑ دیا، وہ تصوف ہے جو اسلام کی سرزمین میں ایک اجنبی پودا ہے لیکن اس کی جڑیں بڑی دور تک جا چکی ہیں۔ تصوف کے متعلق میں پہلے بھی تفصیل کے ساتھ بیان کر چکا ہوں اور میرا یہ مقالہ طلوعِ اسلام جولائی و اگست [illegible] میں شائع ہو چکا ہے۔

(۵) یہ سازشیں قرآن کے معانی کے متعلق تھیں۔ اس کے علاوہ ایک وہ سازش ہے جو خود الفاظِ قرآن کے متعلق ہے۔ یہ الفاظِ قرآن کو یقین سے شک میں بدلنے کی سازش ہے۔ اس میں یہ خیال عام کر دیا گیا کہ نبی اکرمؐ قرآن کریم کو مرتب کر کے موجودہ شکل میں امت کو نہیں دے گئے تھے۔ اور قرآن کریم کے الفاظ میں پہلی صدی کے آخر تک تبدیلیاں ہوتی رہیں اور بعض آیات جو نزولِ قرآن کے وقت قرآن میں موجود تھیں، وہ اب موجود نہیں۔ اور بعض آیات جو اس وقت قرآن میں موجود ہیں، ان کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ اور یہ کہ خود نبی اکرمؐ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ اگر وہ کسی سے لکھواتے بھی ہوں گے تو کیا پتہ کہ لکھنے والا کیا لکھتا تھا۔

(۶) مذکورہ سازشوں کا آغاز ماضی بعید میں ہوا۔ پھر یہ اسلاف کا سرمایہ اور ورثہ بن کر عقیدہ اور ایمان کی حیثیت اختیار کر کے ہم تک پہنچیں۔ لیکن اس کے علاوہ ایک اور سازش بھی ہے جس کے "بیج" بہت پہلے بوئے گئے تھے لیکن اس کے شگوفے اس عہد میں پھوٹے اور ہمارے ہی عہد میں اسے پروان چڑھانے کی منظم کوششیں شروع ہوئیں اور اب تک جاری ہیں۔ قرآن کے خلاف سلسلہ دراز میں یہ کڑی سب سے زیادہ دور رس ہے اور اس سے ہماری زندگی کے تمام گوشے متاثر ہوتے ہیں۔ ہمارا دعوےٰ ہے کہ الدّین آج صرف قرآن کی دفتین میں محفوظ ہے اب یہ نہ ان کے پاس ہے جن کے پاس اس سے قبل آیا اور نہ ان کے پاس جو ایسا دعویٰ ہی نہیں کرتے۔ لیکن یہ سازش کہتی ہے کہ عالمگیر سچائیاں اور اخلاقی ضابطے تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائے جاتے ہیں۔ اس لئے تمام مذاہب کی سچائیاں اکٹھی کر لی جائیں اور ایک ایسا دین لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے جو سب کے لئے قابلِ قبول ہو۔ دوسرے مذاہب (ON MERIT) کبھی اسلام کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے یہ کہا گیا کہ کسی ایک مذہب کو دوسرے پر فوقیت حاصل نہیں۔

برادران! ان سازشوں میں سے ہر سازش ایک طویل داستان ہے اور محترم پرویز صاحب نے ان کو ۱۹۶۰ء کے شروع میں آٹھ لیکچروں میں تفصیلاً بیان کیا تھا۔ اور یہ وہ نایاب چیز ہے جو آپ کو کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتی۔

حضرات! میں نے تھوڑے سے تھوڑے وقت میں اور تھوڑے سے تھوڑے الفاظ میں زیادہ سے زیادہ کہنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ ممکن نہیں کہ میں اس قلیل وقت میں ان تمام نکات کو مختصر طور پر بھی بیان کر سکوں

جو محترم پرویز صاحب اپنے درس کے طویل سلسلہ میں بیان کرتے رہے ہیں۔ اس لئے جو چند نکات بیان کئے ہیں انہی پر اکتفا کرتا ہوں۔

محترم پرویز صاحب درس کو از سرِ نو جاری کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی صحت اور ہمت کو برقرار رکھے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس شمع قرآنی سے روشنی حاصل کرتے رہیں اور زمانے کی فضا سے زیادہ سے زیادہ تاریکیاں دور ہوتی جائیں ۔۔۔ میں پچھلے روز بھی عرض کر چکا ہوں اور آج پھر عرض کرتا ہوں کہ سامعین درس پر بھی کچھ ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں۔ ہم نے گزشتہ اتوار (یعنی ۷ جنوری ۱۹۸۰ء کو) مل جل کر محترم پرویز صاحب کا زبانی شکریہ ادا کیا۔ یہ بھی اپنی جگہ درست ہے، یہ بھی شکریہ کا ایک حصہ ہے۔ پورا شکریہ نہیں۔ پرویز صاحب کی لغات القرآن میں شکر کے معنی یہ لکھے ہیں: "انسان کی طرف سے شکر کے معنی اطاعت و ادائے فرائض۔ نیز احسان مندی کے جذبات کا اظہار۔ اور خدا کی طرف سے شکر کے معنی پورا پورا بدلہ دینا۔ یا تھوڑے عمل کا بڑھا کر اجر دینا ہے۔" شکر کے یہ بنیادی معنی سامنے رکھنے سے سعیٔ مشکور کا مطلب سمجھ میں آجاتا ہے۔ یعنی ایسی کوشش جس کے بھرپور نتائج سامنے آجائیں۔ چنانچہ برادران! ہم نے اپنے محسن کی احسان مندی کے جذبات کا اظہار تو ضرور کیا لیکن سعیٔ مشکور یعنی ایسی کوشش جس کے بھرپور نتائج سامنے آجائیں' باقی ہے۔ ہمارے ذمے اپنی اصلاح باقی ہے۔ ہمارے ذمے معاشرے کی اصلاح باقی ہے۔ ہمارے ذمے معاشرے میں قرآنی انقلاب لانا باقی ہے۔ ہمارے ذمے قرآن کی تعلیم کو عام کرنا باقی ہے۔ ہمارے ذمے قرآنی مطالب کی مزید وضاحت کے لئے کوشش کرنا باقی ہے۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میرے ذمے وہ فرائض بھی ہیں جو معاشرے کی طرف سے عاید ہوتے ہیں۔ ان میں وہ فرائض بھی شامل ہیں جو بیوی بچوں کی طرف سے عاید ہوتے ہیں۔ وہ فرائض بھی ہیں جو ادارہ دو انتظامیہ کی طرف سے عاید ہوتے ہیں۔ وہ فرائض بھی ہیں جو میرے پروفیشن کی طرف سے عاید ہوتے ہیں ۔۔۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے توفیق دے کہ میں ان تمام ذمہ داریوں کو' جو از روئے قرآن مجھ پر عاید ہوتی ہیں' پورا کرتا رہوں اور محترم پرویز صاحب کا جو میرے ذمے قرض ہے' اس کو چکا دوں۔ یہی صحیح معنوں میں ان کا شکریہ ہوگا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔

ضروری اطلاع

پرچہ ہر ماہ کی یکم تاریخ کو ارسال کر دیا جاتا ہے۔ اگر دس تاریخ تک پرچہ موصول نہ ہو تو اسکی اطلاع پندرہ تاریخ تک ادارہ کو پہنچ جانی چاہیئے۔ پرچہ دوبارہ بھیجدیا جائیگا۔ نیز خط و کتابت کرتے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھا کیجئے۔ ناظم

بابُ المراسلات

(۱) بین الاقوامی اسلامی کانفرنس

ایک صاحب نے مجھے لکھا ہے کہ "اخبار ایشیاء کی سہ فروری کی اشاعت میں ... بین الاقوامی اسلامی کانفرنس کے سلسلہ میں" ڈاکٹر افضل الرحمٰن صاحب کے ساتھ آپکا نام بھی لیا گیا تھا۔ کیا اس کانفرنس کے اہتمام کے سلسلہ میں آپ کا بھی کوئی حصہ تھا؟" چونکہ اس قسم کے استفسارات اور گوشوں سے بھی موصول ہوئے ہیں اسلئے میں نے مناسب سمجھا ہے کہ طلوعِ اسلام کی وساطت سے پوزیشن واضح کر دی جائے۔

یہ کانفرنس' ادارہ تحقیقات اسلامی کے زیر اہتمام منعقد ہوئی تھی۔ میرا اسکے اہتمام میں کوئی حصہ نہیں تھا۔ البتہ مجھے اس میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی جسے میں نے معذرت کے ساتھ نامنظور کر دیا تھا۔　　　(پرویز)

---

(۲) پرسشِ غم کا شکریہ

رفیقِ حیات مرحوم حبیب اللہ خان کی ناگہانی وفات حسرت آیات کے دلخراش حادثۂ المناک پر میرے قرآنی بہن بھائیوں نے جس اپنائیت سے انفرادی طور پر اور طلوعِ اسلام کی مختلف بزموں نے اپنی اپنی قرار داد تعزیت کے ذریعے میرے ساتھ جو خلوص و تاثر بھرا اظہار غم کیا ہے اور میرے اس صدمۂ جگر پاش میں شریک ہوئے ہیں، میں اس کے لئے ان سب کی تہ دل سے ممنون ہوں۔ اپنی اس ویرانیٔ دل میں میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ میں فرداً فرداً ان سب کا شکریہ ادا کر سکوں اور علیحدہ علیحدہ ان تعزیت ناموں کا جواب دے سکوں۔ اس لئے میں طلوعِ اسلام کی معرفت ان سب کی سپاس گزار ہوتی ہوں۔

حبیب زندگی کی رفاقت سے اس طرح محروم ہو جانے سے مجھ پر غم والم کا جو پہاڑ ٹوٹا ہے اور میری دنیا پر جو قیامت آئی ہے اس کو جھیل سکنا اگرچہ ممکن نظر نہیں آتا لیکن میں اپنے قرآنی احباب سے یہ توقع رکھتی ہوں کہ وہ خدا تعالےٰ کے حضور اپنی دل فگار اور غم نصیب بہن کے حق میں یہ دعا کریں گے کہ وہ ذات کریم اسے وہ تقویتِ قلب عطا کرے جس کی بدولت حوصلہ و استقامت کے ساتھ یہ صدمۂ عظیم برداشت ہو جائے۔

ایک دفعہ پھر میں اپنے شریکِ غم قرآنی بہن بھائیوں کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔

والسلام ـــــ!

(دل فگار) ثریا عندلیب

آپ کو لاہور سے کسی کتاب کی ضرورت ہو

وہ ادارہ طلوعِ اسلام کی مطبوعات میں سے ہو یا کسی اور بلند پایہ مصنّف کی تصنیف

آپ خود تشریف لاکر یا ایک کارڈ لکھ کر

مکتبۂ دین و دانش

سے خرید سکتے ہیں

لائبریریوں اور دکان دار حضرات کو

معقول کمیشن دیا جائے گا!

عارف بٹالوی

پروپرائیٹر مکتبۂ دین و دانش

پتہ:۔ چوک اردو بازار ۔ جلال الدّین ٹرسٹ بلڈنگ ۔ لاہور

مژدۂ بہار!

والہانِ سیرتِ طیبہ کی طرف سے مسلسل استفسارات موصول ہو رہے ہیں کہ
پرویز صاحب کی مایۂ ناز و عشق افروز کتاب

معراجِ انسانیت

کا نیا ایڈیشن کب تک تیار ہو جائے گا۔ ان کی اطلاع کے لئے تحریر ہے کہ کتاب چھپ رہی ہے اور
امید ہے کہ اپریل کے شروع تک کتاب شائقین کے ہاتھوں میں پہنچ جائیگی۔
احباب کی فرمائشیں ترتیب کے ساتھ نوٹ کی جا رہی ہیں۔ اور اسی ترتیب سے کتاب بھیجی جائے گی!

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵/بی - گلبرگ - لاہور

ISLAM:
A CHALLENGE To RELIGION

پرویز صاحب کی اس انقلاب آفریں کتاب کے متعلق متعدد مقامات سے استفسارات
موصول رہے ہیں۔ اطلاعاً تحریر ہے کہ کتاب کے قریب ایک صد صفحات
چھپ چکے ہیں اور امید ہے کہ دو ماہ کے اندر اندر مکمل کتاب مارکیٹ میں آجائے گی!

جن احباب نے اپنی فرمائشیں بھیجی ہیں۔ سب سے
پہلے انہیں کتاب بھیجی جائے گی!

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

ادارہ طلوعِ اسلام کی

حیات افروز پیشکش

پاکستان کا معمارِ اوّل

سرسید کی صحیح عظمت اور ہماری سیاسی زندگی میں اس کا بلند مقام ابھی ہمارے سامنے نہیں آیا۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر سرسید نہ ہوتا تو پاکستان بھی وجود میں نہ آتا۔ اس مختصر لیکن نہایت جامع کتاب میں سرسید کا صحیح مقام نہایت دلکش انداز میں سامنے لایا گیا ہے۔

قیمت صرف تین روپے

قرآنی قوانین

ایک نہایت جامع کتاب جو عام طبقے کے علاوہ وکلاء حضرات اور جج صاحبان کے لئے بڑی مفید ثابت ہوگی۔ اس میں ان تمام احکام کو مرتب کر دیا گیا ہے جو قرآن کریم میں بطور قوانین دیئے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں ان مستقل اقدار کو بھی مدون کر دیا گیا ہے جنکی روشنی میں امت عصرِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق خود جزئی قوانین مرتب کرے گی۔

قیمت صرف تین روپے

جہاد

اسلام کے اس بنیادی اصول کے متعلق حقیقت کشا بحث۔ اسلامی لڑائیوں کے متعلق معترضین کے اعتراضات اور ان کا مدلل جواب۔ ایک مختصر لیکن جامع تصنیف۔ بصیرت افروز حیات آور!

قیمت صرف۔ دو روپے۔

عربی خود سیکھئے

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گیا تھا۔ اسکے جدید ایڈیشن میں قریب ایک سو صفحات پر مشتمل ایسے گوشواروں کا اضافہ کر دیا گیا ہے جن میں ساری عربی گرامر سمٹ کر آ گئی ہے۔

قیمت :۔ صرف ساڑھے چار روپے

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام۔ ۲۵/بی گلبرگ لاہور

ماہنامہ طلوعِ اسلام اور طلوعِ اسلام کی کتابیں مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور کے علاوہ

یہاں سے بھی مل سکتی ہیں

لاہور: (۱) انٹرنیشنل بک سروس ۔۔ ۔۔ ۵۷ دی مال لاہور

(۲) کلاسیک بکسیلرز ۔۔ ۔۔ ۴۲ " "

(۳) پیپلز پبلشنگ ہاؤس ۔۔ ۔۔ ۲۶ " "

(۴) زریں بک ایجنسی ۔ ۔۔ ۶۱ ریلوے روڈ "

(۵) لاہور بک ڈپو ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۶۵ دی مال "

(۶) بک سنٹر ۔۔ ۔۔ چوک بیگل " "

(۷) ادبستان ۔۔ ۔۔ چوک لکشمی میکلوڈ روڈ "

(۸) آسیڈیل بک شاپ ۔۔ ۔۔ ۱۹۴ انارکلی "

(۹) مکتبۂ پاکستان ۔۔ ۔۔ چوک " "

(۱۰) گوشۂ ادب ۔۔ ۔۔ " " "

(۱۱) اسمٰعیل اینڈ برادرز ۔۔ ۔۔ " " "

(۱۲) نیشنل بک سٹال ۔۔ " " " "

(۱۳) ماڈل بک سٹال ۔۔ ۔۔ ٹولنٹن مارکیٹ دی مال "

(۱۴) اوریگا بک سٹال ۔۔ گلبرگ ۲ لاہور

(۱۵) پیپلز پبلشنگ ہاؤس ۔ المنار مارکیٹ، چوک انارکلی ۔ لاہور

لائلپور: (۱) شریف برادرز بکسیلرز کارخانہ بازار ۔ لائلپور

(۲) حافظ محمد یونس صاحب ۔ اے ۲۷ ۔ گلبرگ ۔ لائلپور

سرگودھا: حکیم محمد حسن نظامی ۔ نظامی دواخانہ

بلاک ۲ ۔ گلی مچھلی والی ۔ سرگودھا ۔

میانوالی: صوفی عبدالرحمٰن صاحب جلد ساز

چوک فتح خان ۔ ملک ظفر سٹریٹ ۔ میانوالی ۔

کراچی: (۱) محترم محمد اسلام صاحب ۔ (۱۰۰۴)

وکٹیس روڈ ۔ نیو ٹاؤن ۔ کراچی ۔ ۵

(۲) ہر اتوار کی صبح ۔ ۹ بجے تا ۱۲ بجے

سندھ اسمبلی ہال ۔ بندر روڈ

(۳) کلکڈز انجمن کتاب گھر ۔ وکٹوریہ روڈ ۔ صدر

(۴) عوامی کتب خانہ ۔ بولٹن مارکیٹ

(۵) شیخ شوکت علی اینڈ سنز ۔ بندر روڈ ۔ کراچی ۔

(۶) جنرل بکڈپو ۔ فریئر روڈ ۔ نزد حبیب بنک ۔ کراچی ۔

(۷) اقبال کتاب گھر ۔ سمرسٹ سٹریٹ ۔ کراچی صدر ۔

راولپنڈی: (۱) محترم عزیز احمد قریشی صاحب ۔ ۲۰۳ ۔ F بعالجز خانہ

(۲) بک سنٹر ۔ لارنس روڈ

(۳) ظفر بک سٹال ۔ گورنمنٹ ٹرانسپورٹ سٹینڈ ۔ صدر

(۴) گورنمنٹ ٹرانسپورٹ سٹینڈ ۔ اسلام آباد

(۵) بک سٹال ۔ چوک فوارہ ۔ راجہ بازار ۔

لیہ: مغل ہوٹل ۔ نزد ریلوے سٹیشن

ہر جمعہ کو بعد نماز عصر

انگلستان: محترم رشید احمد بٹ صاحب

۱۴۰ ۔ سالٹ اسٹریٹ ۔ بریڈفورڈ ۸

مردان: (۱) صادق کمیشن ایجنسی ۔ بکٹ گنج

(۲) صدیقیہ انجنیئرنگ ورکس ۔ بنک روڈ

ملتان: دانشکدہ حسین آگاہی ۔

مطالب الفرقان کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔

مطالبُ الفرقان

(اُنتیسواں پارہ - سابقہ شمارہ سے مسلسل)

سُورۃ المعارج (۷۰)

(۱) - (اے رسول!) تمہارے مخالفین، جو حق و صداقت کا انکار کرتے ہیں، بار بار تقاضا کرتے ہیں کہ جس عذاب کی انہیں دھمکی دی جاتی ہے وہ آتا کیوں نہیں۔ ان سے کہو کہ تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ تم کس چیز کے لئے یوں تقاضا پر تقاضا کر رہے ہو، وہ کوئی خوش آئند بات نہیں۔ وہ ایک آفت ہے جو تم پر آنے والی ہے۔

(۲) اور جب وہ آئے گی تو دنیا کی کوئی طاقت اسے ہٹا نہیں سکے گی۔

(۳) اس کے آنے میں وقت اس لئے لگ رہا ہے کہ اسے اُس خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق واقع ہونا ہے جو اپنی ہر اسکیم کو ارتقائی مدارج (کی سیڑھیاں) چڑھا کر تکمیل تک پہنچاتا ہے۔ اُسے اُس کے نقطۂ آغاز سے تکمیل تک یک لخت نہیں لے جاتا۔ وہ بتدریج ایسا کرتا ہے۔

(۴) اُس کا انداز یہ ہے کہ وہ اپنی اسکیم کا آغاز اُس کے پست ترین نقطہ سے کرتا ہے۔ پھر کائناتی قوتیں (جو عالمِ خلق میں کارفرما ہیں)، اور الوہیاتی توانائی (جو عالمِ امر میں روبعمل ہے) اُس اسکیم کو تکمیل تک لے جانے کے لئے اوپر اٹھتی ہیں۔ اور اس طرح اُسے ارتقائی مدارج طے کراتی ہوئی، آگے بڑھاتی ہیں۔ یہ مراحل بڑے طویل المیعاد وقفوں میں طے ہوتے ہیں جن کی مدت ہزار ہزار، بلکہ پچاس پچاس ہزار سال کی ہوتی ہے۔

(۲۲/۴۷ ؛ ۳۲/۵ ؛ ۳۵/۱۰ ؛ ۳۶/۸۰ ؛ ۴۷/۹)۔

(۵) - لہٰذا، تمہیں اِن کے اِن تقاضوں سے مضطرب نہیں ہونا چاہیئے۔ تم اپنے پروگرام پر حسن کارانہ انداز سے ثابت قدم رہو۔ یہ اپنے وقت پر تکمیل تک پہنچے گا۔

(۶) یہ سمجھتے ہیں کہ وہ تباہی کہیں بہت دور ہے۔

(۷) لیکن ہم اسے بہت قریب دیکھ رہے ہیں۔

(۸) اُس وقت ان بڑے بڑے، فلک نشین سرداروں کی قوتیں پگھل کر پانی ہو جائینگی۔ تمام سرفرازیاں اور اور سربلندیاں پست ہو جائیں گی۔ ان کی محکم گرفتیں ڈھیلی پڑ جائینگی۔ (۷۰:۸)

(۹) اور یہ جو اِس وقت پہاڑ کی طرح جمے ہوئے نظر آتے ہیں، (دھنی ہوئی) اون کی طرح فضا میں اُڑتے دکھائی دینگے[1] (۷۰:۹) اور شاخِ شکستہ کی طرح خمیدہ کمر ہو جائینگے۔

(۱۰) اور نفسا نفسی کا یہ عالم ہوگا کہ عزیز سے عزیز دوست بھی ایک دوسرے کو نہیں پوچھیں گے (کہ ان پر کیا بیت رہی ہے)

(۱۱) حالانکہ وہ دیکھ رہے ہوں گے کہ وہ کس مصیبت میں مبتلا ہیں۔ اور مجرمین اپنے ان دوستوں کو دیکھ رہے ہوں گے کہ وہ ان کی کوئی مدد نہیں کرتے۔

(۱۲-۱۳) ان میں سے ہر مجرم یہ چاہے گا کہ وہ کسی اور کو اپنی جگہ فدیہ کے طور پر دے کر، خود اُس عذاب سے چھوٹ جائے ـــ اپنے بیٹے، بیوی، بھائی یا دیگر خویش قبیلے کے لوگوں کو جن کی خاطر اُس نے سب اصول چھوڑ دیئے تھے اور جو اُس کی پشت پناہ بننے کے مدعی تھے۔

(۱۴) حتیٰ کہ وہ ساری دنیا کا مال و دولت دے کر اس عذاب سے چھوٹ جانے کی خواہش کریگا۔

(۱۵) لیکن وہ اس کے بھڑکتے ہوئے شعلوں سے بچ نہیں سکے گا۔

(۱۶) وہ انسان کی تمام قوتوں کو کھینچ کر نکال باہر کرے گی اور اِس طرح اُسے یکسر بیکار اور ذلیل و خوار بنا کر رکھدے گی۔

(۱۷) وہ کچھ دور نہیں۔ وہ تو آوازیں دے دیکر بلا رہی ہے ہر اُس شخص کو جو اِس نظام کی طرف سے منہ موڑ کر بھاگتا اور گریز کی راہیں نکالتا ہے۔

(۱۸) یعنی جو مال و دولت کو ربوبیتِ عامہ کے لئے کھلا نہیں رکھتا بلکہ اسے تھیلی میں جمع کرتا ہے اور پھر اس کا منہ اوپر سے کس کر باندھ دیتا ہے (۷۰:۱۸) تجوریاں بھرتا چلا جاتا ہے۔

(۱۹) (ذرا غور کرو کہ انسان جب وحی کی راہ نمائی کو چھوڑ کر حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتا ہے تو، وہ کسقدر تنگ دل۔ بھوکا اور بے صبرا ہو جاتا ہے۔

---

[1] تیسویں پارہ کے شروع کا نوٹ دیکھئے

(۲۰) بے صبری کا یہ عالم کہ ذرا سی تکلیف پہنچے تو واویلا مچانا شروع کر دیتا ہے۔ تنگ دل ایسا کہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی، "ہے نہیں۔ ہے نہیں" کی رٹ لگاتا رہتا ہے۔

(۲۱) اور چھوکا ایسا کہ جب مال و دولت ہاتھ آجائے تو وہ اس کی ضرورت سے کتنا ہی وافر کیوں نہ ہو، اس میں سے ایک پائی بھی کسی ضرورت مند کو نہیں دیتا۔

(۲۲) البتہ وہ لوگ ایسا نہیں کرتے جو مصلیٰ ہیں۔

(۲۳) یعنی وہ لوگ جو اپنے انفرادی مفاد کے پیچھے چلنے کے بجائے، خدا کے نظامِ ربوبیت کے پیچھے چلتے ہیں، اور اس روش پر نہایت ہمت اور استقلال اور التزام اور مداومت سے قائم رہتے ہیں۔

(۲۴) اور اس طرح اپنی تنگ دلی کو کشادہ ظرفی سے بدل کر اس حقیقت کو سمجھ لیتے ہیں کہ اُن کا مال صرف اُن کے انفرادی مفاد کے لئے نہیں۔

(۲۵) بلکہ اس میں ان لوگوں کا، جن کی ضروریات ان کی کمائی سے پوری نہ ہوتی ہوں، یا جو کمانے کے قابل نہ رہیں اور اس طرح اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم رہ جائیں، حق ہے۔ اور حق بھی ایسا جس کا سب کو علم ہے اس لئے وہ ان کا حق انہیں لوٹا دیتے ہیں، اور اپنی ضروریات سے زاید اپنے لئے رکھتے ہی نہیں۔

(۲۶) یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کے قانونِ مکافات پر محکم یقین رکھتے ہیں اور اپنے اس ایمان کو اپنے عمل سے سچ کر دکھاتے ہیں۔

(۲۷) اور اُس کی خلاف ورزی کرنے کے تباہ کن نتائج سے ہمیشہ خائف رہتے ہیں۔

(۲۸) یہ نتائج فی الواقعہ ایسے ہوتے ہیں جن سے کبھی نڈر نہیں ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ ان سے کسی کو کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔ اس قسم کا معاشرہ جس کا نظام مندرجہ بالا خطوط پر متشکل نہ ہو تباہ ہو کر رہتا ہے۔

(۲۹) اس کے علاوہ ان لوگوں کی اور خصوصیات بھی ہیں۔ (مثلاً) یہ اپنی عصمت کی حفاظت کرتے ہیں۔ مرد، عورت، دونوں یکساں طور پر۔

(۳۰) لیکن اس سے یہ مطلب نہیں کہ وہ تجرّد کی راہبانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ جنسی تعلقات کو حدودِ خداوندی کے اندر رکھتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے اپنی منکوحہ بیویوں کے پاس جاتے ہیں یا ان لونڈیوں کے پاس جو اس سے پہلے (عرب کی عام معاشرت کے مطابق) ان کے ہاتھ لگ گئی تھیں، اور جنہیں اب بیویوں کا درجہ دے کر اُن سے جنسی تعلقات کو قانوناً جائز قرار دے دیا گیا ہے (۴/۲۵)۔ البتہ اس کے بعد اس طرح لونڈیاں حاصل کرنے کے سلسلہ کو ختم کر دیا گیا ہے۔ (۴۷/۴)

(۳۱) جو شخص، اس کے علاوہ، جنسی تعلق کی کوئی اور صورت تلاش کرے تو وہ حدود شکنی ہے (اسے اس

جرم کی سزا ملے گی)

(اگرچہ مومن عورتیں بھی اپنے قلب و نگاہ کی عفت کو محفوظ رکھیں گی لیکن جب مرد مندرجہ بالا پابندیوں کو ملحوظ رکھیں گے تو عورتوں کی عصمت خود بخود محفوظ ہو جائے گی۔ معاشرہ کو با عصمت رکھنے کی ذمہ داری مرد پر ہے۔)

(۳۲)۔ (پھر ان لوگوں کی خصوصیت یہ ہے کہ) یہ اپنی امانتوں کی حفاظت کرتے ہیں اور اپنے وعدوں کا پورا پورا پاس رکھتے ہیں۔ (امانت میں ہر وہ چیز داخل ہے جسے انسان دوسرے کو سونپ کر اپنے آپ کو امن میں محسوس کرے۔ اور وعدوں میں انفرادی وعدوں سے لے کر بین الاقوامی معاہدات تک سب شامل ہیں۔ اور تمام ذمہ داریاں بھی)۔

(۳۳) اور جب کبھی کسی معاملہ میں شہادت دیتے ہیں تو ہمیشہ حق و انصاف پر قائم رہتے ہیں (ان شہادات کا دائرہ عدالت تک محدود نہیں۔ زندگی کے ہر گوشے میں انسانی شہادت سامنے آسکتی ہے۔)

(۳۴) مختصراً یہ کہ یہ لوگ، خدا کے متعین کردہ نظامِ صلوٰۃ کے محافظ ہوتے ہیں (خود اس پر التزاماً قائم رہتے ہیں اور اسے قائم اور مستحکم رکھنے کے لئے کوشاں و سرگرداں)۔

(۳۵) یہ لوگ ہیں جو باعزت جنتی معاشرہ کے مستحق ہیں۔ (۲۳/۱-۱۰)

(اس دنیا میں بھی اور اُخروی زندگی میں بھی)۔

(۳۶-۳۷)۔ (یہ بات ہو رہی تھی مومنین کے متعلق۔ لیکن جب ان کفار نے اسے سنا تو یوں سمجھ بیٹھے گویا جنت مفت بٹ رہی ہے چلو ہم بھی اس لوٹ کے مال میں سے کچھ حصہ لے لیں۔ چنانچہ وہ اس خیال کے ماتحت) گروہ در گروہ، دائیں بائیں سے لپک کر تیری طرف چلے آ رہے ہیں۔

(۳۸) ان میں سے ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ جن آسائشوں اور خوشگواریوں کا اہلِ جنت کے ضمن ذکر کیا جاتا ہے، وہ اسے مل جائیں۔ یعنی وہ اپنی روش میں تو کوئی تبدیلی پیدا نہ کریں اور ویسے ہی چاہیں کہ انہیں وہ ثمار حاصل ہو جائیں۔

(۳۹) لیکن یہ ظاہر ہے کہ وہ جنتی زندگی اس طرح نہیں مل سکتی۔

انہیں اس کا اچھی طرح سے علم ہے کہ ان کی خلقت سے مقصود یہ تھا کہ یہ قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کریں (۵۱/۵۶)، سو جب یہ اس کے باوجود، ان قوانین سے سرکشی اختیار کریں تو پھر زندگی کی خوشگواریوں کے امیدوار کیسے ہو سکتے ہیں؟ (جنتی معاشرہ متشکل کرنے والے نظام کے قیام کی راہ میں تو سنگِ گراں بن کر حائل ہوں، اور توقع یہ رکھیں کہ اس کے آسائش بخش برگ و بار ان کی جھولیوں میں آ پڑیں۔ یہ بھلا کیسے

ممکن ہے؟)

(۴۰، ۴۱) خدا کی ربوبیتِ عامہ جو اس کائنات کے مشارق و مغارب میں اس نظم و ضبط کے ساتھ پھیلی ہوئی ہے، اس حقیقت پر شاہد ہے کہ جو لوگ انسانی معاشرہ میں، اس نظامِ ربوبیت کے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جائیں، ہم اس پر قادر ہیں کہ ہم ان کی جگہ ایسے لوگوں کو لے آئیں جو ان سے بہتر ہوں ۔۔ یہ مخالفین، نہ تو ہمارے حیطۂ اقتدار سے نکل سکتے ہیں۔ اور نہ ہی ہماری اسکیموں کو ناکام بنا سکتے ہیں۔

(۴۲) سو تو ان کی پرواہ مت کر۔ انہیں ان کی بے معنی منصوبہ بندیوں اور بے مقصد کوششوں، بے منزل سفر اور نظری مباحثوں، بیکار گفتگوؤں اور کھیل تماشوں میں مشغول رہنے دے۔ یہاں تک کہ وہ انقلاب ان کے سامنے آکھڑا ہو جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے زندگی کو مذاق اور کاروانِ انسانیت کو بے منزل سمجھ رکھا ہے۔ اس روش اور ذہنیت کا نتیجہ تباہی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

(۴۳) اس وقت یہ اپنے اپنے ٹھکانوں سے اس تیزی سے نکل کھڑے ہوں گے جس طرح تیر اپنے نشانے کی طرف سیدھا جاتا ہے۔ اور یوں یہ کشاں کشاں اپنے تباہی کے مقام پر جمع ہو جائیں گے۔ (جو قوم کوئی نصب العین متعین طور پر اپنے سامنے نہیں رکھتی اس کی کوششیں مختلف سمتوں میں منتشر ہو کر بکھر کر رہ جاتی ہیں۔ لیکن اس کاروان کے بکھرے ہوئے افراد، بالآخر، اپنی تباہی کے گھاٹ پر سب اکٹھے ہو جاتے ہیں)۔

(۴۴) لیکن تاسف و ندامت سے اس وقت اُن کی حالت یہ ہوتی ہے کہ نگاہیں زمین میں گڑی ہوئیں اور ذلت و خواری کی کالک چہروں پر جمی ہوئی۔ یہ اس انقلاب کا دن ہوگا جس کے متعلق ان سے کہا جاتا ہے کہ وہ آنے والا ہے۔ (اور جس کی بابت یہ تقاضے پر تقاضا کر رہے ہیں کہ وہ جلدی کیوں نہیں آتا۔ (۲۰))

سورۃ النوح (۷۱)

(۱) ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف یہ کہہ کر بھیجا کہ وہ انہیں، ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر دے، قبل اس کے کہ دردناک تباہی کا عذاب ان کے سر پر آکھڑا ہو۔

(۲) چنانچہ اُس نے اپنی قوم سے کہا کہ میں تمہیں کھلے کھلے الفاظ میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ تمہاری موجودہ روش تمہیں تباہی کی طرف لئے جا رہی ہے۔

(۳) اگر تم اس تباہی سے بچنا چاہتے ہو تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ تم قوانینِ خداوندی کی محکومیت اختیار کرو۔ اس کے احکام کی پوری پوری نگہداشت کرو۔ اس کا عملی طریق یہ ہے کہ تم اس نظام کی اطاعت کرو جسے میں اُن قوانین کے نفاذ کے لئے متشکل کر رہا ہوں۔ (اور جس کا اولین سربراہ میں ہوں)

(۴) اگر تم نے ایسا کر لیا تو خدا تمہاری سابقہ روش کے مضر نتائج سے تمہاری حفاظت کا سامان مہیا کر دے گا۔ اور یوں ایک مدت تک تم سامانِ زیست سے متمتع ہوتے رہو گے۔ یعنی جب تک تم صحیح راستے پر چلتے رہو گے، تباہی سے محفوظ رہو گے۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا اور وہ عذاب تمہارے سر پر آگیا تو پھر اسے کوئی نہیں ٹال سکے گا۔ اے کاش! تم خدا کے اس قانونِ مکافات کو سمجھ سکتے۔

(۵)۔ (نوحؑ نے اپنی قوم کی اصلاح کی پوری پوری کوشش کی لیکن انہوں نے اس کی ایک نہ مانی۔ بالآخر اس نے اپنے نشوونما دینے والے سے کہا کہ میں اس قوم کو دن رات تیرے راستے کی طرف دعوت دیتا رہا۔

(۶) لیکن ان کی حالت یہ ہے کہ میں جوں جوں انہیں اس طرف بلاتا ہوں، یہ اس سے اور دور بھاگتے ہیں۔

(۷) میں انہیں امن و سلامتی کی طرف دعوت دیتا ہوں تاکہ یہ تباہی سے بچ جائیں۔ لیکن ان کی کیفیت یہ ہے کہ اول تو یہ اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں تاکہ یہ میری بات سنیں ہی نہیں۔ اور اگر کبھی میری بات سنتے ہیں تو بالکل منافقانہ انداز سے۔ بظاہر بات پر کان دھرتے ہوئے لیکن دل کو یوں لپیٹے ہوئے کہ اس میں ایک لفظ تک نہ پہنچنے پائے (۳۵)۔ (انہیں ہزار سمجھاؤ) لیکن یہ اپنی ضد پر اڑے رہتے ہیں۔ اور بڑی ہی سرکشی اختیار کرتے ہیں۔

(۸۔ ۹) میں نے ان کے عام مجمعوں سے بھی خطاب کیا (اور الگ الگ مجلسوں سے بھی)۔ انہیں اعلانیہ سمجھانے کی بھی کوشش کی، اور علیحدگی میں بھی۔ (غرضیکہ میں نے انہیں نصیحت کرنے کا کوئی طریق نہیں چھوڑا لیکن یہ ہیں کہ ٹس سے مس نہیں ہوتے)۔

(۱۰) میں نے ان سے بار بار کہا کہ تمہاری غلط روش بڑے تباہ کن نتائج پیدا کرے گی۔ تم قوانینِ خداوندی کی اطاعت کے ذریعے اس تباہی سے نکلنے کا سامان پیدا کرو۔ خدا کا قانون تمہیں اس سے بچا لیگا۔

(۱۱)۔ (اور علاوہ اُخروی زندگی کی سرفرازیوں کے، وہ تمہیں اس دنیا کی زندگی میں بھی خوشحالیاں اور خوشگواریاں عطا کرے گا)۔ وہ ایسی بابرکت بارش برسائے گا جس سے تمہاری بنجر زمینیں سیراب ہو جائیں گی۔

(۱۲) اس طرح وہ تمہارے مال و دولت میں اضافہ کرے گا۔ تمہارے افراد خاندان میں کثرت ہوگی۔

تمہارے ہاں سرسبز باغات پیدا کرے گا۔ اور ان کی سیرابی کے لئے پانی کی ندیاں رواں ہونگی (جب معاشرہ صحیح خطوط پر متشکل ہوجاتا ہے تو اس کا حسنِ نظم و نسق ہر قسم کی فراوانیاں پیدا کر دیتا ہے)

(۱۳)۔ (میں حیران ہوں کہ) تمہیں کیا ہو گیا ہے جو اس قسم کی باوقار زندگی کی آرزو نہیں کرتے، جو قوانین خداوندی کے اتباع سے مل سکتی ہے۔ یعنی ایسی زندگی جس میں ٹھہراؤ ہو، استحکام ہو، بخود خزیدن ہو، اپنے پاؤں پر جم کر کھڑے ہو جانا ہو، حکمیت ہو، ثبات ہو۔ یونہی ایک جھٹکے سے بکھر یا پگھل جانا نہ ہو۔

(۱۴) یہ زندگی کیسے حاصل ہوگی؟ اس کے لئے تم خدا کے قانونِ تخلیق کی کارفرمائی پر غور کرو جس کے مطابق تم مختلف تخلیقی مراحل طے کرتے ہوئے، انسانی پیکر تک پہنچے ہو۔ (ان تخلیقی مراحل میں تمہارا ہر قدم آگے کی طرف بڑھتا گیا، اور تم اوپر کی طرف اٹھتے گئے۔ یہ سب تمہارے اختیار و ارادہ کے بغیر ہوتا رہا۔ لیکن جونہی بات تمہارے اختیار تک پہنچی، تم نے غلط راستے اختیار کر لئے، جس سے تم پستی کی طرف گرتے چلے گئے۔)

(۱۵) تم ذرا غور کرو کہ قوانینِ خداوندی کے مطابق چلنے سے زندگی کا انداز کیا متوازن اور حسین ہو جاتا ہے تم دیکھو کہ اللہ نے فضا کی پہنائیوں میں ان مختلف کروں کو پیدا کیا ہے تو وہ کس طرح باہدگر کامل موافقت اور ہم آہنگی سے چلتے رہتے ہیں۔ وہ اس قدر تیز گردش کے باوجود اپنے اپنے مقام پر محکم اور قائم رہتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ وہ انفرادی زندگی بسر نہیں کرتے۔ ان میں سے ایک کی کشش دوسرے کے ثبات کا موجب بنتی ہے اور اس طرح یہ سارا نظامِ فلکی بغیر کسی تصادم کے مصروفِ عمل رہتا ہے۔ ان کے برعکس تم اپنی زندگی کو دیکھو کہ اس میں قدم قدم پر ایک دوسرے سے تصادم ہوتا ہے)

(۱۶) پھر دیکھو کہ اس نے (انہی کروں میں سے) چاند کو کس طرح نورانی قندیل، اور سورج کو جگمگاتا چراغ بنا دیا ہے (لیکن تم اپنی زندگی کو دیکھو کہ وہ کیسی بھیانک تاریکیوں میں گزر رہی ہے) اگر تم بھی قوانینِ خداوندی کا اتباع کرو تو نہ صرف یہ کہ تمہاری اپنی زندگی کی راہیں روشن ہو جائیں بلکہ تم دوسروں کے لئے بھی قندیلِ راہ بن جاؤ۔)

(۱۷)۔ (تمہارا باہمی ٹکراؤ اس لئے ہوتا ہے کہ تم سب، اپنے آپ کو، ایک دوسرے سے الگ سمجھتے ہو، انفرادی مفاد پرستی کی بیچڑوں نے تمہیں جدا جدا کر رکھا ہے۔ ۲۳/۳۔ حالانکہ) خدا نے تمہاری تخلیق نباتات کی طرح کی ہے، (کہ زمین سے ایک تنا اوپر کو ابھرتا ہے لیکن آگے جا کر اس کی بے شمار شاخیں ادھر ادھر پھیل جاتی ہیں۔ اس کے باوجود، ان کا باہمی تعلق اس قدر گہرا ہوتا ہے کہ جڑ زمین سے خوراک حاصل کرتی ہے۔ وہ اسے اپنے لئے سمیٹ کر نہیں رکھ لیتی۔ وہ اسے پتی پتی تک بقدرِ ضرورت پہنچاتی ہے۔ اور اگر پتیاں ہوا سے

نمی اور حرارت جذب کرتی ہیں تو وہ انہیں درخت کی رگ رگ تک پہنچا دیتی ہیں۔ یوں پورے کا پورا درخت سرسبز و شاداب رہتا ہے۔ پوری نوعِ انسانی کی تخلیق بھی ایک شجرِ طیبہ کی طرح ہوتی ہے۔ اس کی سرسبزی و برومندی کا راز بھی باہمی ربط و ضبط اور اشتراک و تعاون میں ہے۔ یہی ہے وہ نظام جس کی طرف میں تمہیں دعوت دیتا ہوں۔

(۱۸) یوں بھی انسان کی تخلیق کی ابتداء (نباتات کی طرح) بے جان مادہ سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ تمہیں، تمہاری حیاتِ ارضی کے تحت، مختلف گردشیں دیتا رہتا ہے۔ اور ہر گردش کے بعد، ایک نئے انداز سے تمہاری نمود ہوتی ہے اور تم سلسلہ ارتقاء کی ایک اور منزل طے کر لیتے ہو۔ زندگی کا یہی ارتقائی پروگرام موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔

(۱۹، ۲۰)۔ (اس نے تمہیں دنیا میں پیدا کیا تو اس کے ساتھ ہی تمہاری زیست کے عجیب و غریب سامان پیدا کر دیئے۔ سب سے پہلے تو اس کرۂ ارض پر غور کرو کہ اس نے اسے "گول ہونے کے باوجود) ایسا بسیط قطعہ بنا دیا کہ تم اس کے کشادہ راستوں میں جہاں جی چاہے چل پھر سکتے ہو۔

(۲۱)۔ (غرضیکہ نوحؑ نے انہیں مختلف انداز سے، مثالیں دے دے کر سمجھایا لیکن انہوں نے اس کی ایک نہ مانی۔ آخر الامر اس نے اپنے رب سے فریاد کی اور کہا کہ) اے میرے نشوونما دینے والے! تو دیکھتا ہے کہ میری تمام کوششوں کے باوجود، یہ لوگ برابر میری مخالفت کئے جا رہے ہیں اور اس شخص کے پیچھے چل رہے ہیں جس میں اس کے سوا کوئی خصوصیت نہیں کہ اس کے پاس بہت سی دولت ہے اور افرادِ خاندان کی کثرت ــــ حالانکہ انہی چیزوں نے اُسے، صحیح راستے کی طرف آنے سے روک رکھا ہے اور اس لئے" اس کے (اور اس کے متبعین) کے حق میں تباہی کا موجب بن رہی ہیں۔

(۲۲) یہ (میری اس دعوت کے خلاف) بڑی بڑی سازشیں کر رہے ہیں۔

(۲۳) اور لوگوں سے کہہ رہے ہیں کہ تم اپنے معبودوں کو بالکل نہ چھوڑنا ــــ نہ وَدّ کو، نہ سواع کو۔ نہ یغوث و یعوق کو اور نہ ہی نسر کو ــــ (یہ مٹی اور پتھر کے تراشے ہوئے بت، درحقیقت ان غیر محسوس بتوں کے محسوس پیکر ہیں جو ان کے قلب و دماغ کے بتکدوں میں نصب ہیں)۔

(۲۴) انہوں نے اس طرح ساری قوم کو غلط راستے پر ڈال رکھا ہے۔ اب تو ان سرکشوں اور ظالموں کی ہلاکت اور بربادی کی رفتار کو تیز تر کر دے۔

(۲۵) چنانچہ وہ اپنی غلط کاریوں اور خطا کوشیوں کی وجہ سے غرق ہو گئے، اور پھر جہنم کے عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ سو انہوں نے دیکھ لیا کہ خدا کے سوا اُن کا کوئی مددگار نہیں تھا۔ (وہ جن بتوں کی پرستش کیا کرتے تھے،

نہ تو وہی ان کی مدد کو پہنچے، اور نہ ہی وہ لیڈر جن کا وہ اتباع کرتے تھے)

(۲۶) (وہ پوری کی پوری قوم اس حد تک سرکشی میں آگے بڑھ چکی تھی، اور ان کے جرائم ایسے متعدی ہو رہے تھے، کہ باقی انسانوں کو ان کے اثرات سے بچانا نہایت ضروری تھا۔ اس مقصد کے پیش نظر) نوحؑ نے اپنے ربّ سے دعا کی تھی کہ ان سرکشوں میں سے کسی ایک گھرانے کو بھی ملک میں بسنے کے لئے باقی نہ چھوڑ۔

(۲۷) اس نے کہا کہ اگر تو نے انہیں باقی چھوڑ دیا تو وہ تیرے بندوں کو بُری طرح گمراہ کریں گے، اور پھر ان کی اولاد بھی ان کے زیر تربیت پرورش پاکر انہی جیسی سرکش اور نافرماں بردار ہو گی۔ لہٰذا، ان کا سلسلہ ہی ختم کر دے تو اچھا ہے (تاکہ ان کی جگہ ان سے کوئی بہتر قوم لے لے۔ جیسے مریض کا مرض متعدی ہو جائے کہ اس کے جراثیم اس کی اولاد تک میں منتقل ہو کر آجائیں، اور مرض لاعلاج ہو چکا ہو، اس کا ختم ہو جانا ہی بہتر ہوتا ہے)

(۲۸) اے میرے نشو و نما دینے والے! تو ان سرکشوں کی دراز دستی سے میری حفاظت فرما — میری بھی اور میرے ماں باپ کی بھی (جو مومن ہیں) اور میرے اہل خانہ میں سے جو ایمان لائے اس کی بھی۔ اور دیگر مومن مردوں اور عورتوں کی بھی۔ باقی رہے یہ ظالم اور سرکش۔ تو انہیں تباہی اور بربادی میں آگے بڑھاتے جا۔ (یہی ایک طریق ہے جس سے انسانیت ان کے متعدی جرائم سے محفوظ رہ سکیگی)۔

سُورۃ الجنّ - (۷۲)

(۱)۔ (اے رسولؐ!) ان سے کہہ دو کہ مجھے بذریعہ وحی بتایا گیا ہے کہ ایک غیر مانوس، بادیہ نشین، قبیلہ کی ایک جماعت نے دوسروں سے چھپ کر قرآن سنا تو کہنے لگے کہ ہم نے ایک عجیب و غریب چیز سنی ہے (۴۶)۔

(۲) جو کچھ ہم نے سنا ہے اس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ بالکل سیدھے راستے کی طرف راہ نمائی کرتا ہے۔ سو ہم اس پر ایمان لاتے ہیں۔ اس کے بعد ہم اپنے ربّ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں قرار دینگے۔

(۳) ہمارے نشو و نما دینے والے کی شان بہت بلند ہے۔ اس کی نہ کوئی بیوی ہے نہ اولاد۔ (ہمارے یہ عقاید توہم پرستی پر مبنی تھے جن سے ہم تائب ہوتے ہیں)۔

(۴) یہ جہالت آمیز عقاید ہم میں سے کچھ بیوقوف لوگوں نے اپنے ذہن سے وضع کئے اور پھر انہیں خدا کی طرف منسوب کر دیا۔

(۵) حالانکہ ہم (سادہ لوح) یہ خیال کیا کرتے تھے کہ انسان خواہ شہری ہوں یا صحرائی، کم ازکم خدا کیطرف غلط باتیں منسوب کرنے کی جرأت نہیں کرسکتے۔

(۶) لیکن ہوتا یہ رہا کہ شہری آبادی کے لوگ ہمارے پاس آکر رہتے اور لوگوں کو اس قسم کی جہالت آمیز باتیں سکھاتے (یوں ان توہم پرستیوں کا ہم میں بھی رواج ہوگیا۔ اور جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، ان میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔)

(۷)۔ (وہ ہم سے کہا کرتے تھے کہ) یہ جو تمہارا عقیدہ ہے کہ اس علاقہ (عرب) میں کوئی رسول وغیرہ نہیں آئے گا، درست ہے۔ ہمارا خود یہی عقیدہ ہے۔ (اس لئے ہمارے کاہن ہی ہمارے مذہبی پیشوا ہوسکتے ہیں۔ جو کچھ یہ کہیں، اسے سچ ماننا چاہیئے۔)

(۸)۔ (اس قسم کے عقاید کی رُو سے ہم سمجھا کرتے تھے کہ ہم یعنی ہمارے کاہن۔ پروہت اور منتری، اپنی کہانت اور نجوم کے ذریعے) آسمانوں کی باتیں معلوم کرلیتے ہیں۔ لیکن (اس قرآن کے سامنے آجانے کے بعد ہمیں یقین ہوگیا ہے کہ آسمان کی خبریں لانا، انسان کے بس کی بات نہیں)۔ وہاں بڑے بڑے پہرے دار ہاتھوں میں آتشیں کوڑے لئے بیٹھے ہیں۔ (۱۵/۱۷-۱۸)

(۹) اس سے پہلے ہم یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ ہم گھات میں بیٹھ کر آسمانی باتیں سن لیتے ہیں۔ لیکن اب جو کوئی سننے کی کوشش کرتا ہے، اپنے سامنے (علم و برہان کے) شعلے دیکھتا ہے۔ (لہٰذا، اب کہانت کا دور ختم ہوگیا۔ قرآن نے یوں ہمارے عقاید بدل دیئے ہیں۔ ۳۷/۶-۹ ؛ ۶۷/۵)

(۱۰)، ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس انقلاب کا، جس کا پیامبر قرآن ہے، ردِّ عمل کیا ہوگا۔ کیا لوگ اسکی مخالفت کرکے، تباہ و برباد ہوں گے یا یہ صحیح راستے پر آکر، خیر و برکت سے ہمکنار ہوں گے۔

(۱۱) ہم یہ اس لئے کہتے ہیں کہ سب لوگ ایک ہی خیال اور طریق کے نہیں۔۔۔ بعض ہم سے نیک ہیں اور بعض دوسرے انداز کے ہیں۔ مختلف لوگ مختلف طریقوں پر چلتے ہیں، اس لئے ان کا ردِّ عمل بھی مختلف ہوگا۔ (اس سے باہمی تصادم کا بھی امکان ہے جس کا نتیجہ خوں ریزی ہوگا۔)

(۱۲)۔ (ہم نے اسے اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ خدا کا اقتدار اس قدر زبردست ہے کہ) ہم، نہ تو اسے اپنے ملک میں شکست دے سکتے ہیں، اور نہ ہی اس سے بھاگ کر کسی ایسی جگہ جاسکتے ہیں جو اس کے حیطۂ اقتدار سے باہر ہو۔ اس کا قانونِ مکافات ہر جگہ موجود ہے۔

(۱۳) یہ وجہ تھی کہ ہم نے جب اس ہدایت (قرآنی) کو سنا تو ہم اس کی صداقت پر ایمان لے آئے۔ اور ہمیں یقین ہے کہ جو کوئی بھی خدا پر ایمان لے آتا ہے، اُسے، نہ اپنے حقوق میں کمی کا احتمال ہوسکتا ہے، اور نہ

ہی کسی قسم کی ذلت و رسوائی کا خوف۔ اس کے اعمال کا پورا پورا نتیجہ اسے ملے گا۔ اور وہ عزت و سربلندی کی زندگی بسر کرے گا۔

(۱۴) چنانچہ اب ہم میں سے بعض لوگ تو اس قانون کے سامنے سرِ تسلیم خم کر چکے ہیں، اور بعض ایسے ہیں جو ابھی تک بے انصافی کی راہ پر چلے جا رہے ہیں۔ جو لوگ اس کے سامنے جھکتے ہیں، تو یہی لوگ ہیں جو رشد و ہدایت کے حصول کے لئے عزیمت مندانہ قصد کرتے ہیں۔

(۱۵) لیکن جو لوگ اس سے روگردانی کر کے، ظلم و سرکشی کی راہ اختیار کرتے ہیں، وہ جہنم کا ایندھن ہیں۔

(۱۶) (یہ تھا جو کچھ ان بادیہ نشین لوگوں نے، جا کر اپنی قوم سے کہا تھا)۔ اس کے بعد، اے رسول! تو اپنے مخاطبین سے کہہ دے کہ) اگر تم لوگ خدا کے بتائے ہوئے طریقہ پر استقامت سے چلتے رہتے تو خدا تمہیں وسعت اور فراوانیوں کی سرسبز و شاداب زندگی عطا کرتا۔

(۱۷) یہ ہے وہ کھلا ہوا معیار جس کے مطابق یہ واضح ہو جاتا ہے کہ خدا کے سامنے پر چلنے والے کون ہیں۔ اس کے برعکس، جو شخص اپنے خدا کے قانونِ ربوبیت سے روگردانی کرتا ہے، وہ سخت مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

(۱۸)۔ ان سے واضح طور پر کہہ دو کہ دین کی اصل و بنیاد یہ ہے کہ) اطاعت و فرماں پذیری صرف قوانینِ خداوندی کی ہو سکتی ہے۔ جھکنا صرف انہی قوانین کے سامنے چاہیئے۔ ان کے ساتھ، کسی اور کے قانون کو شامل نہیں کرنا چاہیئے۔ کسی اور کی اطاعت اختیار نہیں کرنی چاہیئے۔ (۷۲/۱۸)

(۱۹) (ہونا تو یہ چاہیئے۔ لیکن ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ، خود، خدا کے قوانین کے سامنے جھکنا تو ایک طرف) جب خدا کا ایک بندہ (رسول اللہ) اس دعوت کو لے کر اٹھا تو یہ لوگ مخالفتوں کے ہجوم کے ساتھ یوں امنڈ پڑے گویا اسے کچل ہی ڈالیں گے۔ (۷۲/۱۹)

(۲۰) ان سے کہہ دو کہ میرا جرم اس کے سوا کیا ہے کہ میں خود بھی خالص قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتا ہوں اور تمہیں بھی اسی کی دعوت دیتا ہوں۔ اور اس میں کسی دوسرے کے قانون اور فیصلے کو شریک نہیں کرتا۔

(۲۱)۔ (انسان، اطاعت اسی کی اختیار کرتا ہے جس کے متعلق خیال ہو کہ وہ اسے نفع یا نقصان پہنچانے کا اختیار رکھتا ہے۔ اور یہاں یہ عالم ہے کہ اور تو اور) میں خود بھی کوئی اختیار و اقتدار نہیں رکھتا کہ تمہیں کسی قسم کا نفع یا نقصان پہنچا سکوں۔ (یہ سب، خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔)

(۲۲)۔ (کسی کو نفع یا نقصان پہنچانا تو ایک طرف، اگر میں خود بھی خدا کے قانون کی خلاف ورزی کروں تو، نہ تو دنیا میں کوئی قوت ایسی ہے جو مجھے اس کے خلاف پناہ دے سکے۔ اور نہ ہی میں، اپنی کوشش سے، کوئی

پناہ گاہ تلاش کر سکوں گا۔ اگر مجھے پناہ مل سکتی ہے تو صرف خدا کے قانون کے سایہ میں مل سکتی ہے۔

(۲۳)۔ (لہٰذا میرا یہ دعویٰ نہیں کہ میں کسی قسم کی قوت اور اختیار رکھتا ہوں۔ میرا کام یہ ہے کہ) میں قوانینِ خداوندی کو — یعنی ان قوانین و احکام کو جو اُس نے مجھے دیئے ہیں — تم تک پہنچا دوں۔ (اس کے بعد، تمہیں اختیار ہے کہ تم انہیں مانو یا ان کی مخالفت کرو۔ لیکن اتنا سن رکھو کہ) جو شخص بھی خدا کے اس نظام کی مخالفت کرے گا (جسے اس کا رسول اس کے قوانین کے مطابق متشکل کرتا ہے تو) اس کے لئے جہنم کا عذاب ہوگا جس میں وہ ہمیشہ رہیگا۔

(۲۴)۔ (اس وقت یہ مخالفین اس زعم میں ہیں کہ ان کا جتھہ بہت بڑا ہے۔ ان کے مقابلہ میں جماعت مومنین کی تعداد بھی بہت کم ہے اور ان کے حمایتی بھی بہت کمزور ہیں) لیکن جب وہ تباہی جس کے متعلق اوپر کہا گیا ہے، ان کے سامنے آجائے گی تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ کس کے حمایتی کمزور ہیں اور کس کی جماعت کی تعداد کم ہے۔

(۲۵)۔ (یہ تم سے پوچھتے ہیں کہ یہ عذاب ان پر آئے گا کب؟) ان سے کہہ دو کہ میں نہیں جانتا کہ وہ عذاب جلدی آئے گا یا میرا نشوونما دینے والا اس کی مدت کو طول کر دے گا۔ (اور وہ دیر میں واقع ہوگا)

(۲۶) مستقبل کا علم صرف خدا کو ہوتا ہے۔ وہ اس کے متعلق کسی کو خبر نہیں دیتا۔

(۲۷) البتہ وہ جس شخص کو رسالت کے لئے منتخب کرتا ہے، اسے مستقبل کے متعلق جس قدر بتانا مقصود ہوتا ہے، وحی کے ذریعے بتا دیتا ہے۔ اور اس کی (وحی) کی حفاظت کے لئے اس کے آگے اور پیچھے محافظ مقرر کر دیتا ہے۔ (یہ وحی قرآن کے اندر ہے اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے)

(۲۸) یہ محافظ اس لئے مقرر کئے جاتے ہیں تاکہ واضح ہو جائے کہ ان رسولوں نے خدا کے پیغامات بحفاظت لوگوں تک پہنچا دیئے ہیں۔ (رسولوں کی ذمہ داری اتنی ہی ہے۔ اس کے بعد اسے لوگوں پر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرتے ہیں یا اس سے سرکشی اختیار کرتے ہیں۔ وہ جونسا راستہ اختیار کرینگے اس کے مطابق نتیجہ مرتب ہو جائے گا) اس کا قانونِ مکافات لوگوں کے تمام اعمال کو محیط ہے اور اس نے ہر شے کو اچھی طرح سے محفوظ رکھ چھوڑا ہے۔ (اس لئے کسی کا کوئی عمل اس کے قانونِ مکافات کے دائرے سے باہر نہیں رہ سکتا)۔

(اس سورت سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ قرآن کریم کی زبان ایسی سادہ اور واضح ہے کہ ایک صحرانشین بدو بھی اسے نہایت آسانی سے سمجھ سکتا تھا۔ اور دوسرے یہ کہ اگر انسان کے ذہن پر تعصب کے تالے نہ پڑے ہوں تو

قرآنی حقائق فوراً دل پر اُتر جاتے ہیں۔ ان صحرانشینوں نے پہلی مرتبہ قرآن کریم کا ایک مختصر سا حصہ سُنا اور ان میں اس قدر قلب ماہیئت ہوگئی)۔

سُورۃ المُزّمّل (٧٣)

(١) اے رسول! فریضۂ رسالت کی عظیم ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کے بعد، تیرے لئے پہلا قدم یہ ہے کہ تو ایسے رفقائے سفر تیار کرے جن میں کامل ہم آہنگی اور یک رنگی ہو۔ (تاکہ یہ کاروان شاداں و فرحاں منزلِ مقصود کی طرف قدم بڑھاتا چلا جائے)

(٢) اس کے لئے ان کی تعلیم و تربیت ضروری ہے۔ (دن میں تجھے فرصت کم ہوگی۔ اس لئے) اس مقصد کے لئے رات کو بھی جاگنا ہوگا (٦٦/٧٣ ؛ ١٦/٣٦)

(٣) لیکن ساری رات نہیں، آدھی رات تک۔ یا اس سے کچھ کم یا ذرا زیادہ۔

(٤) اپنے اس اجتماع میں، تو انہیں قرآن کو اس طرح سمجھا کر اس کا حسنِ ترتیب اور نظم و تناسب، ابھر کر ان کے سامنے آجائے۔ پھر اسی ترتیب اور نظم و ضبط کے ساتھ اسے عمل میں لاتے چلے جاؤ۔ (ہم نے قرآن کو جس حسنِ ترتیب و تناسب کے ساتھ مرتوط کیا ہے (٣٢/٢٥) اسی حسنِ نظم و ترتیب کے ساتھ تم اس پر عمل کرتے جاؤ)

(٥) حقیقت یہ ہے کہ اب ہم تجھ پر ایک بہت بڑی ذمہ داری ڈالنے والے ہیں۔ (اب قرآن کے ذریعے معاشرہ میں انقلاب برپا کرکے، نظامِ خداوندی کی عملی تشکیل کا مرحلہ سامنے آتا ہے۔ یہ بڑا ہمت طلب، اور صبر آزما کام ہے)

(٦)۔ (ہم نے جو کہا ہے کہ اپنے رفقاء کی تعلیم و تربیت کا کام رات کے وقت کیا کرو تو اس کی کئی وجوہات ہیں)۔ ایک تو یہ کہ رات کے قیام سے، انسان، سہل انکاری کے جذبات پر قابو پا لیتا ہے اور اس طرح اس کی قوتِ عمل میں پختگی آجاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ رات کے سکوت میں، انسانی معاملات پر غور و فکر اچھی طرح ہو سکتا ہے اور بات ابھر اور نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔

(٧) پھر یہ بھی کہ دن میں تجھے مخالفتوں کے ہجوم کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اس سلسلہ میں تیرے سامنے اتنے کام ہوتے ہیں کہ تجھے سارا دن سرگرداں رہنا پڑتا ہے (اس لئے ذہنی کاموں کے لئے قدرے سکون کی

ضرورت ہو' ان کے لئے دن میں وقت ہی نہیں مل سکتا)

(۸) اس طرح' دن رات' اپنے نشو و نما دینے والے کی صفات کو اپنے سامنے رکھ (ذکر الٰہی صفات کو معاشرہ میں عملاً نافذ کرنا مقصود ہے۔ اس مقصد کے لئے) اپنی تمام توجہات کو' دوسری اطراف سے ہٹا کر' اسی ایک نقطہ پر مرکوز کر دے' اور نہایت حسن کارانہ انداز سے اس مقصد کے حصول کے لئے مصروفِ عمل رہ۔

(۹) تیرے پیشِ نظر' ایک عالمگیر انقلاب کا پروگرام ہے — اور وہ انقلاب یہ ہے کہ ہر غیر خداوندی اقتدار و اختیار کو ختم کر کے' اس کی جگہ ایک خدا کی حکومت قائم کر دی جائے۔ انسان' قوانینِ خداوندی کے علاوہ' کسی کا محکوم اور اطاعت گزار نہ ہو۔ اس کے لئے تو قانونِ خداوندی پر پورا پورا بھروسہ کر کے آگے بڑھتا چلا جا۔ (یہ نظام خطۂ عرب سے آگے بڑھ کر اس کے مشرق و مغرب — ایران و روم — تک پھیل جائے گا۔ اور آخر الامر عالمگیر ہو جائے گا)

(۱۰) اور اپنے مخالفین کی کسی بات سے متاثر مت ہو' بلکہ' ان کی طرف سے صرفِ نظر کر کے' اپنے پروگرام پر ثبات اور استقامت سے جمے رہو۔ اور اپنے دامن کو ان خار دار جھاڑیوں سے حسن کارانہ انداز سے بچاتے چلے جاؤ۔ (۷۳ : ۱۰)

(۱۱) یہ لوگ جو' اپنی دولت کے نشے میں' ہمارے قوانین کی تکذیب کرتے ہیں' انہیں ہمارے قانونِ مکافات کے حوالے کر دو۔ اور انہیں تھوڑی سی مہلت دے دو۔ ہمارا قانون ان سرمایہ داروں سے خود نپٹ لیگا۔

(۱۲) ان کے لئے ہم نے بیڑیاں اور ہتھکڑیاں تیار کر رکھی ہیں' جو ان کی بے باک آزادیوں کے لئے روک بن جائیں گی۔

(۱۳) اور ایسا کھانا جو حلق میں جا کر اٹک جاتا ہے — یعنی نہایت دردناک سزا — (نظامِ سرمایہ داری کا انجام یہی ہوتا ہے کہ ان کی اپنی دولت ان کے لئے عذاب بن جاتی ہے اور اس طرح ان کا نوالہ جو دوسروں کی کمائی کو غصب کر کے حاصل کیا گیا تھا' حلق میں اٹک کر ان کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ اس نظام کی بنیاد میں تباہی کی صورت مضمر ہوتی ہے)

(۱۴) اس وقت' یہ تمام بڑے بڑے سردار اور ان کے متبع عوام (تمہاری قوت کے سامنے) کانپ اٹھیں گے۔ ان کے سرغنوں کی — جو اس وقت پہاڑ کی طرح محکم نظر آ رہے ہیں — بالخصوص یہ حالت ہو گی۔ گویا ریت کا تودہ ہے جو خود بخود پھسلتا چلا جا رہا ہے[۱]

---

[۱] انتیسویں پارہ کا ابتدائی نوٹ دیکھئے۔

(۱۵) اے رسول! تم ان لوگوں سے کہہ دو کہ نہ یہ مقصد، جس کے لئے مجھے بھیجا گیا ہے، کوئی نیا مقصد ہے، اور نہ ہی مخالفین کا ایسا انجام، جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، کوئی نرالا انجام۔ اسی قسم کی انقلاب آفرینی کے لئے سابقہ انبیاء کرام آتے رہے، اور اسی قسم کا انجام ان کے مخالفین کا ہوا۔ ان میں، موسیٰ کے ہاتھوں لایا ہوا انقلاب، اور فرعون کا انجام، بڑی نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ ہم نے اسی مقصد کے لئے موسیٰ، ان لوگوں کی طرف بھیجا ہے تاکہ تو ان کے اعمال کی نگرانی کرے۔

(۱۶) فرعون نے، موسیٰ کے پیش کردہ قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتی تو ہمارے قانونِ مکافات نے اسے ایسی سختی سے پکڑا کہ وہ اس کی گرفت سے نکل نہ سکا۔

(۱۷) ان سے کہو کہ جب فرعون جیسا صاحبِ قوت و جبروت حکمران) ہماری گرفت سے نہ بچ سکا، تو تم ہمارے قوانین سے انکار اور سرکشی برت کر، کیسے بچ جاؤ گے؟ تم پر وہ تباہی آئے گی جس کی شدت اور سختی، بچوں کو بوڑھا کر دیا کرتی ہے۔ (بچپن، مائل بہ عروج ہو کر شباب تک پہنچتا ہے اور پھر زوال شروع ہوتا ہے۔ لیکن اس انقلاب کی رو سے، غلط نظام پر فوراً انحطاط چھا جائے گا۔ وہ جوان ہونے ہی نہیں پائے گا، کہ مرجھا جائے گا)

(۱۸) ایسی سختی، جس سے آسمان پھٹ پڑے۔ یہ تباہی اٹل ہے، واقع ہو کر رہیگی۔

(۱۹) ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں ایک تاریخی حقیقت اور واضح بیان ہے جو عبرت و موعظت کے ہزار سامان اپنے اندر رکھتا ہے جس کا جی چاہے اس سے عبرت حاصل کرے، خدا کے نظامِ ربوبیت کی طرف جانے والا راستہ اختیار کرے۔

(۲۰) (جہاں سے بات چلی تھی، ہم تیری توجہ پھر اسی نکتہ کی طرف منعطف کرانا چاہتے ہیں۔ وہ یہ کہ) تیرا نشوونما دینے والا جانتا ہے کہ تو کبھی دو تہائی رات تک اس پروگرام میں مشغول رہتا ہے اور کبھی آدھی رات تک۔ اور کبھی ایک تہائی شب تک۔ اور تیرے رفقاء کی ایک جماعت بھی تیرے ساتھ ہوتی ہے۔ لیکن اللہ نے رات اور دن کے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں۔ رات کے وقت آرام کرنا بھی ضروری ہوتا ہے (۷۸/۹) وہ جانتا ہے کہ تمہاری بیتابئ تمنا اور وفورِ شوق کا تقاضا ہے کہ یہ پروگرام جلد سے جلد تکمیل تک پہنچ جائے۔ اس لئے تم اپنی نیند اور آرام کا قطعاً خیال نہیں کرتے۔ لیکن، تم لوگ اس روش کو زیادہ دیر تک نباہ نہیں سکو گے۔ اس لئے وہ اس شدت کی اجازت نہیں دے سکتا۔ خاص ہنگامی حالات کی بات اور ہے۔ ان میں زیادہ وقت بھی دیا جا سکتا ہے لیکن عام حالات میں اس حد سے آگے نہیں بڑھنا چاہیئے۔ خدا تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے، لہٰذا، تم قرآنی تعلیم کے جتنے حصے کی، اپنے قلب کی زمین میں بآسانی تخم ریزی کر کے اسے قابلِ نشوونما بنا سکو،

اتنے ہی پر اکتفا کرو۔ وہ جانتا ہے کہ تم میں سے بعض لوگوں کی صحت کمزور ہے اس لئے وہ اس طرح جلدی بیمار پڑ جائیں گے۔ بعض ایسے بھی ہیں جنہیں تلاشِ معاش کی خاطر دوسرے مقامات کی طرف سفر کرنا پڑتا ہے اور انہی میں ایسے لوگ بھی ہیں جنہیں اس نظام کی حفاظت کے لئے میدانِ جنگ میں بھی جانا ہوگا جس کے لئے اچھی صحت اور تنومندی ضروری ہے۔ اس لئے تم قرآن کے اتنے ہی حصہ کو اس طرح دلنشیں کرو جتنا آسانی سے ہو سکے۔ اور اس طرح آہستہ آہستہ نظامِ صلوٰۃ کو قائم کرتے جاؤ اور نوعِ انسانی کی نشوونما کی فکر کرو۔ اور ان مقاصد کے حصول کے لئے اپنی دولت اس نظام کو بطور قرض دے دو، جو تمہیں کئی گنا ہو کر واپس مل جائے گی۔ مختصراً یوں سمجھو کہ (اس پروگرام کے ابتدائی دور میں) جو اچھا کام بھی تم کرو گے، اسے ہم تمہارے کھاتے میں جمع کرتے جائیں گے۔ آخر الامر وہ سب کا سب تمہیں واپس مل جائے گا۔ اور اس کا اجر عظیم الگ ہوگا۔ (یہ نظام تمہاری پائی پائی واپس دے دیگا۔ اور تمہاری ذات کی نشوونما اس پر مستزاد ہوگی)۔ یہ ہے وہ طریق جس سے تم، اپنے خدا سے، ان مخالفین کی طرف سے پیدا کردہ خطرات سے حفاظت کا سامان طلب کرتے رہو۔ وہ تمہیں ان خطرات سے محفوظ بھی رکھیگا، اور تمہاری نشوونما کے فراواں اسباب بھی عطا فرمائے گا۔

ادارہ طلوعِ اسلام کی تازہ ترین پیشکش

سلسبیل

قرآنی فکر کا چشمۂ رواں ـــ قرآنی بصیرت کی جوئے شیر

مفکرِ قرآن محترم پرویز صاحب کے انقلاب انگیز مضامین کا دوسرا مجموعہ

قرآن کریم کی حیات بخش تعلیم۔ پرویز کا حسینِ اندازِ بیان۔ اور

ادارے کی پیشکش ـــ تحفۂ نایاب۔

کتابت طباعت دیدہ زیب۔ کاغذ وہائٹ پرنٹنگ۔ جلد عمدہ۔ گردپوش جاذبِ نگاہ۔

ضخامت ـــ ساڑھے تین سو صفحات

قیمت ـــ مجلد آٹھ روپے

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔ بی گلبرگ ۲ لاہور

لاہور میں فروری کے دوسرے ہفتے ایک کتاب میلہ منعقد ہوا جس میں طلوعِ اسلام کا سٹال بھی لگایا گیا جو آنے والوں کی خصوصی توجہ کا مرکز بنا رہا۔ ہزاروں کی تعداد میں تحریک کا لٹریچر مفت بھی تقسیم کیا گیا ٭